اوراقِ جوش



تحقیق و تدوین

ڈاکٹر ہلال نقوی

اوراقِ جوش

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر ہلال نقوی

اظہار سنز

19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150

ہیڈ آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761

E-mail: izharsons_2004@hotmail.com
www.izhar-sons.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۰ء

نام کتاب: اوراقِ جوش

تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی

ناشر: سید محمد علی انجم رضوی

اظہار سنز۔۱۹۔اردو بازار، لاہور

فون:37230150

طابع: سید اظہار الحسن رضوی

مطبع: اظہار سنز پرنٹرز

۹۔ریٹی گن روڈ۔لاہور۔فون:37220761

قانونی مشیر: ذیشان احمد ملک (ایڈووکیٹ)
0321-4134091

قیمت: -/250 روپے

انتساب

کراچی یونیورسٹی کے

ڈاکٹر سید جعفر احمد

اور

الٰہ آباد یونیورسٹی کے

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

کے نام

مندرجات

کتاب کا پس منظر

بیسویں صدی کے ادبی تخلیق کاروں میں اقبال اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہیں کہ ان کی تمام تر شعری ونثری تحریریں اور خطبات وکلمات آج کے قارئین تک پہنچ چکے ہیں۔ نجی وسرکاری دونوں سطحوں پر ان کے حوالے سے اکیڈمیاں بنیں، لائبریریاں قائم ہوئیں، اخبارات کے ایڈیشن ان سے منسوب ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت کی یادگار پر سیمینارز اور مذاکرات کا سلسلہ رہتا ہے۔ ٹیلی وژن کے مختلف چینلز پر ادبی اور قومی وملی مباحث میں اکثر انہی کی گفتگو رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کے بیشتر تعلیمی اداروں خصوصاً کالجوں کے سالانہ میگزین میں بھی مختلف عنوانات کے تحت اقبال ہی کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش ایک بڑی قد آور تخلیقی شخصیت ہیں لیکن اشاعت وتشہیر کے حوالے سے ان کا معاملہ اقبال کے بالکل برعکس رہا بلکہ فراق و فیض سے سجاد ظہیر، سردار جعفری اور پھر راشد، حفیظ وندیم تک کسی کی ادبی تحریریں اس طرح منتشر نہیں ہیں جس بیدردی سے جوش صاحب کا ادبی اثاثہ بکھرا ہوا ہے۔ انہوں نے بہت کہا اور بہت لکھا لیکن ملیح آباد، لکھنؤ، حیدرآباد دکن، دہلی، کراچی اور پھر اسلام آباد میں ان کی تحریریں یکجا نہیں ہو سکیں۔ ان کی مطبوعات تک یکجا نہیں ہیں غیر مطبوعہ اور گمشدہ تحریروں کا تو ذکر ہی کیا...... ایسے میں 'اوراقِ جوش' ان کے منتشر، گمشدہ اور غیر مطبوعہ ادبی اثاثے کو یکجا کرنے کی ایک کڑی کہی جا سکتی ہے۔

جوش صاحب کے ادبی اعتبارات، ان کے فن کا تخلیقی قد وقامت، ان کی لاتعداد نظموں کے شعری خدوخال، نثر میں ان کی ترجیحات اور امکانات اور پھر ان سب سے اختلاف یا اعتراف۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی تخلیق کار کے متعلق یہ مرحلے ذرا بعد کے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ تو یہی

ہے کہ اس نے زندگی بھر جو لکھا وہ ہمارے سامنے تو ہو۔ میں اپنا شمار جوش صاحب کے ان ادبی عقیدت مندوں میں کرتا ہوں جو ایک عرصے سے اس بات کے متمنی ہیں کہ گروہی جذباتیت اور ادبی تعصبات کو ایک طرف رکھ کر پورے ہوش وحواس کے ساتھ جوش صاحب کو مکمل طور پر دریافت کیا جائے۔

ہماری تہذیبی وادبی تاریخ کے اکثر وبیشتر دانشوروں، ادیبوں اور نقادوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ جوش صاحب اپنے جملہ شعری ونثری اظہار کے ساتھ آج کے قاری کے سامنے نہیں ہیں۔ ان کی مطبوعات خاصی ہیں مگر دستیاب نہیں ہوتیں اور نہ جانے کتنی تحریریں غیر مطبوعہ اور بکھری ہوئی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے معاصرین کی آراء سے کچھ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

☆...... 'جوش صاحب کے دو درجن سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ابھی نہ جانے کتنی نظمیں خوفِ فسادِ خلق کے باعث محرومِ اشاعت ہیں[1]'۔۔۔ سید سبط حسن

☆...... 'یہ تو جوش پر تحقیق کرنے والے ہی بتائیں گے کہ جوش نے کتنے ہزار اشعار کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے[2]'۔۔۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

☆...... 'جوش صاحب کے ادبی کمالات کی تمام کمائیں تو اسی وقت کھلیں گی جب ان کا تمام ادبی سرمایہ ہمارے سامنے ہوگا[3]'۔۔۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

☆...... 'آج جوش کے شعری مجموعے ناپید ہیں[4]'۔۔۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی

---

۱) افکارِ تازہ، مرتب سید جعفر احمد، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۷۔
۲) 'جوش کی شاعری: باغیانہ اور منظریہ جہات'، مشمولہ، ماہنامہ آج کل نئی دہلی، جوش نمبر، اپریل 1995ء، ص ۵۱۔
۳) افتتاحی کلمات، سیمینار بحوالہ نیاز فتح پوری، ۲۰۰۲ء، کراچی۔
۴) جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ، ارتقا مطبوعات، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۸۔

☆...... 'ان کی ڈائریاں، طویل نظم حرفِ آخر، ان کے غیر مدون خطوط، ان کی یادداشتیں اور غیر مطبوعہ کلام کے کئی مجموعے ہنوز تشنۂ طباعت و اشاعت ہیں[5]'۔۔۔ پروفیسر سحر انصاری

☆...... 'جوش کے شعری مطبوعات کی مکمل فہرست کہیں بھی یکجا شائع نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہے کہ اس دور کے سب سے مشہور شاعر کی بعض کتابیں گمنام ہیں[6]'۔۔۔ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

☆...... 'اشارات ان کی وہ کتاب ہے جو رسالہ کلیم میں شائع شدہ اداریوں اور مضامین پر مشتمل ہے اور جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی سے شائع ہوئی تھی اور میری تحقیق کے اعتبار سے کم از کم ہندوستان میں دوبارہ شائع نہ ہو سکی[7]'۔۔۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی

☆...... 'یہ ادب کے اہم معاملات ہیں انھیں سامنے آنا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اشاعتی اور تحقیقی سطح پر جوش صاحب پر مربوط کام کیا جائے[8]'۔۔۔ زاہدہ حنا

ہندوستان اور پاکستان کیا پوری اردو دنیا کے اکثر اہلِ قلم کے جذبات جوش صاحب کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کے حوالے سے کم و بیش یہی ہیں جن کا ذکر درج بالا اقتباسات میں ہے۔ خود جوش صاحب کو بھی اپنی زندگی میں یہ سوال پریشان کیے رہا کہ ان کے تخلیقی سرمائے کو کس طرح محفوظ رکھا جائے۔ انھیں اس بات کا رنج تھا کہ ان کی متعدد تحریریں منتشر ہو گئی ہیں۔ ان کے رنج و ملال اور اس باب میں ان کی شکایتوں سے یہ دو اقتباس آپ بھی پڑھ لیجیے:

'اس زندگی کے دورِ آخر میں کچھ اوپر تین سو رباعیاں بڑی قطع و برید کے

---

۵) جوش شناسی کے ممکنہ زاویے، مشمولہ ارتقا، کراچی، جوش صدی نمبر، دسمبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۶۔
۶) نقوشِ جوش، حیات اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۲۔
۷) اشارات، ادارہ نیا سفر، الٰہ آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۵۔
۸) کالم، روزنامہ جنگ کراچی، ۲۳ فروری ۱۹۸۹ء، ص ۳۔

بعد میں نے صاف کی تھیں ان کے چوری ہو جانے کا مجھ کو بہت قلق ہے۔[9]

'یادوں کی بارات میں نہ صرف جمیل مظہری بلکہ دوسرے دوستوں کا بھی ذکر تھا مگر نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی، کتاب چھپنے گئی تو اس کے اصل مسودات سے بعض تذکرے کوئی لے اڑا۔[10]'

جوش صاحب پر تحقیق کرنے والوں کو اسی قسم کی الجھنوں کا سامنا ہے۔ ادب دوستوں کے لیے یقیناً ان پر تحقیق ایک اہم ادبی فریضہ ہے لیکن اس میں مشکلات اور پیچیدگیاں بھی زیادہ ہیں۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی سے جوش صاحب اور ان کے خاندان سے جو تعلق قائم ہوا تھا اس نے مجھ پر ان کے حوالے سے تحقیق کے کئی در کشادہ کیے۔ جادۂ تحقیق کا مسافر جس شخصیت کے لکھے ہوئے ایک ایک حرف، ایک ایک سطر، اس کے شام و سحر اور اس کے معاملات و مقاصد پر تحقیق و تدوین کے لیے سرگرم عمل ہو تو یہ بات اس کے تحقیقی اُمور کے بہت حد تک خالص ہونے کی دلیل ہوگی کہ اس کے معلوماتی، مشاہداتی اور تحقیقی روابط براہ راست خود اس شخصیت سے رہے ہوں۔ اس اعتبار سے میرے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ میں ان کی صحبتوں میں بیٹھا ہوں اور مجھے ان سے قرب بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی وفات کو اگرچہ آج چوبیس برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی ان کی آواز کانوں میں گونجتی ہے اور میری یادوں کی بیاض میں آج بھی ان کے روز و شب سے متعلق لاتعداد گوشے اور ان کے افق حیات کے روشن اور تاریک دونوں منظر، متحرک تصویروں کی طرح موجود ہیں۔ گھر کے گملے میں چنبیلی کے پودے کو پانی دینے سے لے کر موت کی خزاں رسیدگی پر اظہار تاسف تک ان کے اطوار، گفتار اور کردار کے کتنے ہی چلتے پھرتے منظر اب بھی آنکھوں کے کیمرے میں محفوظ ہیں۔

---

۹) ابتدائیہ قطرہ و قلزم، ستار پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۔
۱۰) مکتوب بنام ہلال نقوی، مشمولہ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، قمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۳۔

ڈاکٹر گیان چند نے 'تحقیق کا فن' میں یہ بات لکھی ہے کہ جس شخصیت پر تحقیق کی جا رہی ہو اس کے گھر میں اگر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹیں اور متنوع کاغذات بھی مل جاتے ہیں تو یہ بھی ایک محقق کے لیے انتہائی بیش بہا سرمایہ ہوگا (طبع سوم ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۳)۔ اسی نوعیت کے بعض بے ترتیب پرزے بھی جوش صاحب پر میری تحقیق کا ایک حصہ ہیں۔ یہ نوادرات ان کے گھر سے ملے۔ میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جب پہلی بار ان کی گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔

۱۹۶۴ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے کراچی کی ایک بستی فیڈرل بی ایریا میں کریم آباد کے بالمقابل سراج الدولہ کالج قائم کیا تھا۔ اردو کے نامور نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین اس کالج میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ میں نے جب یہاں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا تو شعر کہنے کے سبب ان سے قربت ہوتی چلی گئی اور پھر رفتہ رفتہ ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہونے لگا۔ پروفیسر محمد رئیس علوی جو آج کل کراچی یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں وہ بھی مجتبیٰ صاحب کے شاگرد رہے تھے اور اب اسی کالج میں اردو کے لیکچرر تھے۔ کالج کے عقب میں چند فرلانگ کے فاصلے پر جوش صاحب کا گنبد والا مکان تھا...... مجتبیٰ حسین صاحب رئیس صاحب کو لے کر اکثر وہاں جاتے۔ میں بھی پہلی بار مجتبیٰ صاحب کے ساتھ ہی جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر یہ تعلق اس قدر بڑھتا گیا کہ کبھی کبھار صبح دس بجے کے بعد، زیادہ تر سہ پہر کے وقت اور بعض شامیں بھی ان کے گھر پر گزرتیں۔ اسی زمانے میں جوش صاحب کے کہنے پر ان کے ایک نواسے کو میں نے کئی ہفتوں تک اردو شعر و ادب کی تاریخ کے کچھ حصے پڑھائے اور سمجھائے۔ اسی دورِ طالب علمی میں سراج الدولہ کالج سے ایک دیواری اخبار 'مہرِ نیم روز' جاری کیا۔ جوش صاحب اور پروفیسر مجتبیٰ حسین اس اخبار کے سرپرست تھے۔ رئیس علوی صاحب نگراں۔ میرے ذمے اس کی ادارت تھی۔ جوش صاحب اکثر ہمارے کالج آتے، ان کی علم دوستی، مطالعہ اور انتھک محنت ہی سے متاثر ہو کر یہ لگن پیدا ہوئی کہ کیوں نہ جوش صاحب کی تحریروں کو یکجا کیا جائے...... یہ خیال دو وجوہ سے آیا ایک تو ان کے نواسے جوش صاحب کی تحریروں کے ادھر اُدھر ہو جانے کا اکثر ذکر کرتے۔ دوسرے میں نے اس

بارے میں جوش صاحب کی 'بے خبریاں' خود بھی دیکھی تھیں گنبد والے مکان کے پہلے فلور سے اترتے ہوئے زینے کے نیچے گیرج نما حصے میں ایک پھٹی ہوئی بوسیدہ اٹیچی میں ان کے قیمتی ادبی نوادرات تباہی کی نذر ہو رہے تھے۔ اسی نوعیت کے معاملات نے میرے خوابیدہ تحقیقی جذبے کو ایک سنجیدہ تحقیق کی طرف مائل کیا۔ میں نے نوعمری میں غزل اور نظم کے ساتھ مرثیے بھی لکھے تھے۔ اسی سبب سے مجھے جوش صاحب کے مرثیوں سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کی نوعیت مذہبی نہیں ادبی تھی۔ انہی منتشر مرثیوں کو یکجا کرنے کی خواہش جوش صاحب کے بارے میں میرا پہلا تحقیقی کام ٹھہرا۔ جوش صاحب کے ایک رفیقِ دیرینہ مرحوم خورشید علی خاں نے ۱۹۷۰ء کے آس پاس کی یادوں کو قلمبند کرتے ہوئے اپنی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' (مطبوعہ کراچی ۱۹۹۶ء) میں جوش صاحب کے حلقۂ احباب کی ذیلی سرخی کے تحت یہ بات لکھی ہے:

> 'ہماری محفلوں میں اکثر ایک نوجوان شاعر اور محقق ہلال نقوی بھی شریک ہوتے تھے جو جوش صاحب کے مراثی پر تحقیق کر رہے تھے اور جوش صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ (ص۔۸۲)

پھر بات محض ان کے مرثیوں تک محدود نہیں رہی۔ ان کی تمام شاعری اور ان کی تمام نثر دائرۂ تحقیق میں آتی چلی گئی۔ ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے جوش صاحب کی ادبی خدمات پر پی ایچ ڈی کی اجازت چاہی جو نہیں مل سکی اور یہ کہہ کر موضوع کو رد کر دیا گیا کہ کسی ایسی شخصیت پر جو ابھی حیات ہو اس پر تحقیق کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بہر حال تحقیقی مقالہ تو میں نے بیسویں صدی میں لکھے جانے والے جدید طرز کے مرثیوں پر مکمل کیا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو جوش صاحب پر تحقیق کا سفر جاری رہا۔ ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والی دو کتابیں عرفانیاتِ جوش اور جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں اسی متعلقہ تحقیق سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی کتاب مذہبی حوالے سے ان کی شاعری کا مجموعہ تھا جبکہ دوسری کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں ان کی نایاب تحریریں شامل ہیں جن میں نثر زیادہ تھی شاعری کم۔ حیات اکیڈمی کراچی کے بانی اور یونائیٹڈ بینک کے

سابق سینئر ایگزیکٹیو سید سفیر رضا نقوی نے یہ کتاب شائع کی تھی۔ وہ ادب دوست تھے اور عہد آفریں شخصیات سے انہیں قلبی نسبت تھی اور آج بھی ہے لیکن وہ باضابطہ پبلشر نہ کبھی تھے نہ ہیں۔ چنانچہ کتاب کی ادبی حلقوں تک صحیح طور پر ترسیل نہیں ہوسکی۔ اردو دنیا کے بیشتر قاری اس کتاب سے ناواقف رہے اب یہی کتاب کئی اضافوں کے ساتھ 'اوراقِ جوش' کی صورت میں اظہار سنز لاہور کے توسط سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں جوش صاحب کی جو انتہائی نایاب اور غیر مطبوعہ تحریریں ہیں ان کے متعلق میں نے اپنی کتاب میں تمام تحقیقی وضاحتیں کردی تھیں۔ یقیناً ادب کا قاری انہیں جاننا چاہے گا۔ پیش نظر کتاب کے آخری صفحات میں اشاریے سے پہلے آپ اس سابقہ دیباچے کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

کسی بھی کتاب میں اشاریے کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے لیکن ایسی کتابیں جو نادر و نایاب تحریروں پر مشتمل ہوں اور جن کا غالب رجحان تحقیق بھی ہو ان میں اشاریے کی ضرورت بہت اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ ہماری ایک طالبہ، آنسہ مہر النساء عزیز نے بہت کم وقت میں بنیادی معلومات سے آراستہ جو اشاریہ ترتیب دیا اس کے لیے وہ یقیناً شکریے کی مستحق ہیں۔ اس موقع پر اظہار سنز لاہور کے جواں سال پبلشر سید محمد علی انجم رضوی کا نام بھی کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا پبلشر ہونا تو اپنی جگہ پر لیکن ان کے دل میں اہلِ قلم کی جو قدر ہے خصوصاً جوش صاحب کے حوالے سے ان کی یہ خواہش کہ ان کی منتشر تحریریں کسی نہ کسی صورت منظرِ عام پر آتی رہیں، بہت زیادہ لائقِ تحسین ہے۔ آج کی اس کاروباری اور تجارتی دنیا میں سنجیدہ ادب کی اشاعت میں حصہ لینے والے ایسے افراد ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہیں گے۔

ہلال نقوی

اگست کی اکیسویں تاریخ، ۲۰۰۶ء

کراچی، طلوعِ صبح سے پہلے

الفاظ اَور شاعر

(حصہ دوئم)

الفاظ کے باب میں یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے کہ وہ صفحۂ قرطاس پر محض چند مخصوص نشانات یا چند صوتی علامات کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔۔۔۔۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نقوش و علامات نہیں، جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے اَجسام و اَفراد ہوتے ہیں، انسانوں کے مانند ان کے درمیان بھی بلند و پست قبائل و طبقات اور ان قبائل و طبقات کے اندر مخصوص میلانات و روایات پائے جاتے ہیں، وہ اپنی اپنی ٹولیوں میں، بستیاں بسا بسا کر رہتے سہتے ہیں، آدمیوں کے مانند پیدا ہوتے، پروان چڑھتے، عروج و زوال سے دوچار ہوتے، سفر کرتے، مسافرت میں لباس، مزاج اور لہجہ بدلتے، کچھ تو اپنے وطن کو ہمیشہ یاد رکھتے، کچھ بھول جاتے ہیں، کچھ زمانے کی ناسازگاریٔ حوادث کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہیں اور کچھ منہ نہ لگائے جانے کے کرب میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ شہری و مُہذّب ہوتے ہیں، بعض دیہاتی و نامُہذّب، بعض بہادر ہوتے ہیں، بعض بُزدل، بعض کم سخن ہوتے ہیں، بعض بسیار گو، بعض خوش لہجہ ہوتے ہیں، بعض بدلہجہ، بعض شرمیلے ہوتے ہیں، بعض شوخ و شنگ، بعض صنعت کار ہوتے ہیں، بعض فن پرست، بعض سطحی و یک پہلو ہوتے ہیں، بعض عمیق و صد پہلو، بعض درسگاہوں میں آتے جاتے ہیں، بعض منڈیوں کے چکر لگاتے ہیں، بعض میں شاہانہ وقار ہوتا ہے، بعض میں گدایانہ انکساری، بعض بے رنگ و سادہ لباس پہنتے ہیں، بعض نہایت شوخ و شنگ کے بھڑکیلے لباس زیب تن کرتے ہیں، بعض متّقی و سبحہ دردست ہوتے ہیں اور بعض رند سرمست و ساغر بکف۔

بنی نوعِ انسان کے مانند اِن میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، ان کی عورتوں میں بھی اپنے مردوں کی طرح طبقات پائے جاتے ہیں۔ ان کی کچھ عورتیں نہایت قدامت پرست اور سخت

کے ساتھ پردہ نشیں ہوتی ہیں اور اس قدر کہ نامحرموں سے اپنی آواز اور اپنی پرچھائیں تک کو مخفی رکھتی ہیں۔۔۔۔ ان کی کچھ عورتیں نسبتاً شوخ ہوتی ہیں اور صرف کا ناپردہ کرتی ہیں، اور ان کی کچھ عورتیں تو بے حد دلیر ہوتی ہیں سڑکوں پر آنے جانے والوں سے چھیڑ خانیاں کرتی اور بعض تو یہاں تک بڑھ جاتی ہیں کہ بھری محفلوں میں ناچتی گاتی نظر آتی ہیں، لیکن ان متضاد طبقات، عادات اور روایات کے باوجود، مرد و عورت، دونوں قسم کے الفاظ میں یہ ایک مشترک و عام خصوصیت دیکھی جاتی ہے کہ دیر آشنا الفاظ کا تو ذکر ہی کیا، زود آشنا الفاظ بھی اپنے تمام معنوی خصوصیات اور اپنے تمام نسلی جہات کے اعلان و اظہار میں ہمیشہ بخل سے کام لیا کرتے ہیں۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ بخل کی یہ لے یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بازاری الفاظ بھی جو سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرتے، پنواڑیوں کی دکانوں پر پان کھاتے، بدنام کوٹھوں پر ادھم مچاتے اور چاٹ والوں کی بہنگیوں کے سامنے چٹ چاٹتے نظر آتے ہیں، عامۃ الناس سے اپنے تمام معنوی جہات و نسلی خصوصیات چھپاتے اور اپنی صرف دو ایک جھلکیاں دکھا کر اڑ جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب زود آشنا بازاری الفاظ کی روپوشی کا یہ عالم ہے تو ان الفاظ میں روپوشی اور پردگی کا کس قدر مادہ ہوگا جو دیر آشنا اور خلوت پسند واقع ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عالموں، سائنس دانوں، صوفیوں، فلسفیوں، خطیبوں، معلموں اور اسی قبیل کے دیگر حضرات کے ساتھ الفاظ کے تعلقات بڑی حد تک نہایت خوشگوار ہوتے ہیں اور جب یہ حضرات الفاظ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں انہیں آسانی کے ساتھ باریابی کا موقع دے دیا جاتا ہے، اور ان کی خاطر مدارات بھی کی جاتی ہے اور خاندان الفاظ کی کا ناپردہ کرنے والی خواتین بھی ان کے ساتھ آتی جاتی اور ان کی صحبت میں اٹھتی بیٹھتی ہیں لیکن اس کے باوجود الفاظ و خواتین الفاظ کو اس کا خیال رہتا ہے کہ ان کے اور ملاقاتیوں کے مابین ایک اجنبیت آمیز فاصلہ ضرور باقی رہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی خیال میں رہے کہ یہ علماء و فلاسفہ ہوتے ہیں جو الفاظ کے گھر جاتے ہیں، لیکن الفاظ کبھی ان کے گھر نہیں آتے جاتے ہیں۔۔۔۔ لیکن علماء و فلاسفہ کے مقابلے میں

الفاظ ادیبوں سے نسبتاً زیادہ قریب ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ گھل مل کر ملے جلتے ہیں اور بے تکلفانہ تعلقات، آسانی کے ساتھ قائم کر لیتے ہیں، اور اگر ادباء دس پندرہ بار ان کے گھر پر جاتے ہیں تو ایک آدھ بار، وہ بھی بازدید کے طور پر ان کے گھر چلے جاتے ہیں، ادباء کے ساتھ یہ رعایت بھی برتی جاتی ہے کہ وہ پردگیان خاص کے علاوہ، خانوادۂ الفاظ کی تمام نیم پردہ نشین خواتین، نقابیں اُلٹ اُلٹ کر ان کے سامنے آجاتی ہیں، لیکن یہ اور بات ہے کہ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی بات نہیں کرتیں۔ البتہ۔۔۔۔۔ الفاظ و اہل بیت الفاظ کا معاملہ شعراء کے ساتھ قطعی مختلف و استثنائی ہوا کرتا ہے۔

شعراء تین قسم کے ہوتے ہیں۔

o ______ شعرائے درجۂ اول

o ______ شعرائے درجۂ دویم

o ______ شعرائے درجۂ سویم

لطف کی بات یہ ہے کہ شعرائے درجۂ سویم کے ساتھ الفاظ کا جو یگانگی آمیز برتاؤ ہوتا ہے، وہ ادبائے درجۂ اول کے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح شعرائے درجۂ دویم کے ساتھ جو ان کا برتاؤ ہوتا ہے، وہ شعرائے درجۂ سویم کے ساتھ نہیں ہوتا اور شعرائے درجۂ اول کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کے ساتھ تو الفاظ کھلی کھیلتے ہیں، ان کی محفلوں میں دھوم مچاتے ہیں اور اپنی تختی کے ساتھ پردہ کرنے والی خواتین کو بھی ان کے گلے لگاتے ہیں اور اپنے تمام معنوی خصوصیات و نسلی جہات کا ایک ایک عقدہ ان کے روبرو کھول کر رکھ دیتے ہیں اور اس طرح کے شعراء و الفاظ کے مابین کوئی فرق ''من وتو'' باقی نہیں رہتا ہے۔۔۔۔۔ یہ سلسلۂ یگانگی اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ مہینے میں پندرہ روز شاعر اور مہینے میں پندرہ روز الفاظ ''ایک دوسرے کے گھر میں'' مہمان کی صورت سے نہیں اہل بیعت کے مانند رہتے سہتے اور ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈال کر سوتے اور جاگتے ہیں اور جب طرز بیان و قوت فکری کی پختگی کی بدولت، شاعر میں آفاقیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور جب وہ ارض و سماء کی تمام ناقابل قیاس پہنائیوں کا احاطہ کر کے نغمہ سرا ہوتا ہے تو الفاظ اس کے

ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے بے تکلف دوست نہیں رہتے، بلکہ مُرید بن جاتے ہیں اور "ہم زاد" کے مانند تابع ہو کر اس کے اشارہ چشم و ابرو پر ناچنے لگتے ہیں اور جب وہ فکر سخن کے وقت سر جھکاتا ہے تو الفاظ کے لشکر پرے جما کر اس کی جناب میں ہاتھ جوڑے ہوئے حاضر ہوتے اور امتثال امر کی خاطر صف بستہ ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پختگی کی اس خلاقانہ منزل میں شاعر کو الفاظ پر اس قدر خدائی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ الفاظ کو توڑتا مروڑتا ہے اور ان کے مزاجوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ ان کے دھاروں کے رُخ موڑتا ہے اور انہیں از سر نو تراش کر نئی نئی شکلوں میں ڈھال دیتا ہے ـــــــ اور اس سلسلۂ رد و بدل اور اس عمل تراش و خراش میں جب شاعر الفاظ کو ان کے معروف لغوی معنی سے علیحدہ کر کے استعمال کرتا اور انہیں جدید معنی کا خلعت پہناتا ہے تو لُغات و لغات نویس دونوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیا اور یہ جدید و غریب معنی کیوں کر پیدا ہو گئے۔

افسوس کہ میری زندگی کو اس قدر فرصت میسر نہیں ہے کہ اس موضوع پر شرح و بسط سے لکھوں اور پھر اس چند منٹ کی ننھی منی تقریر میں اس کی گنجائش کہاں کہ شعراء و الفاظ کے باب میں جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے، اس کے ثبوت میں شعرائے درجۂ اول کے کلام سے الفاظ تلاش کر کے سامعین کو مطمئن کر دوں، بہر حال، سرسری طور جو اشعار خود بخود یاد آ گئے ہیں، انہیں پیش کیے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے لفظ "بس" کو لیجیے "بس" کے جو لغوی معنی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ لیکن مومن خاں یوں فرماتے ہیں۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس!
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک ذرا سے لفظ "بس" میں شاعر نے اس قدر و شدت و پہنائی پیدا کر دی ہے کہ لغت حیران ہو کر رہ گئی ہے ـــــــ اسی طرح لفظ "کافر" کو لیجیے "کافر" کے جو لغوی معنی ہیں، وہ سب کو معلوم ہیں، لیکن داغ، میر اور غالب اس لفظ کو یوں استعمال کرتے ہیں۔

داغؔ کہتے ہیں۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور میرؔ صاحب فرماتے ہیں۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق ، اختیار کیا

اور غالبؔ فرماتے ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے غیر کا وہ ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک دینی یا شرعی لفظ کو ان حضرات نے لغت سے اس قدر ہٹا کر استعمال فرمایا ہے کہ لغت کا سر چکرا کر رہ گیا۔ اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اسی طرح لفظ ’’بے چارہ‘‘ کو لیجیے اس کے لغوی معنی سب کو معلوم ہیں لیکن ایک ایرانی شاعر نے اس کو یوں استعمال کیا ہے۔ اس ایرانی شاعر کے اس شعر سے پہلے جس میں اس نے لفظ ’’بے چارگاں‘‘ کو استعمال کیا ہے اس سے پہلے کا ایک شعر سن لیجیے تا کہ آپ کو زیادہ لطف حاصل ہو۔ وہ کہتا ہے۔

قومے کہ سرکشند زنخوت بر آسماں
بر آستان میکدہ شانم ندیدہ اند

اب دوسرا ’’بے چارگاں‘‘ والا شعر سنیے۔

آں ہا کہ آورند سبک در نظر مرا ۔ بے چارگاں بکوئے مغانم ندیدہ اند

آپ نے اس ’’بے چارگاں‘‘ کی جدید و غریب معنویت پر نگاہ فرمائی یعنی کس معنی کے لفظ کو

کس معنی سے وابستہ کردیا ہے۔۔۔۔۔۔اسے کہتے ہیں الفاظ پر شعراء کی خدائی۔۔۔۔اسی طرح لفظ ''زندگی'' کو ملاحظہ فرمایئے۔اس کے لغوی معنی بھی اس قدر عام ہیں کہ اس سے ہر عالم و عامی واقف ہے۔۔۔۔۔لیکن ایک شاعر نے جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں، اس لفظ کو یوں استعمال کیا۔

جی لئے چار دن جوانی میں
زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

یہاں ''زندگی'' کو شاعر نے لغت سے اس قدر جدا کر کے استعمال کیا ہے کہ حیرت ہو کر رہ گئی ہے۔زندگی کے معنی ''حیات'' ''لائف'' (Life) اور ''جیون'' ہیں لیکن اس موقع پر زندگی نہ ''حیات'' ہے نہ ''لائف'' ہے نہ ''جیون'' بلکہ اس کے معنی ہیں ''عشرت جوانی'' یا ''بھرپور شباب'' یا سادہ الفاظ میں اس کے معنی ہیں ''جی بھر کے رنگ رلیاں منانے اور دھوم سے جوانی کے رس چوڑنے کا موسم''۔۔۔۔۔۔لغت بیچاری میں اتنی سمائی کہاں کہ وہ ''زندگی'' کو یہ معنی دے سکے۔۔۔۔۔۔اسی طرح لفظ ''قوم'' کو لے لیجئے،اس کے معنی بھی معلوم خواص و عوام ہیں۔لیکن میرزا اسد اللہ خاں غالب نے اسے یوں استعمال فرمایا۔

ے بزہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بشوربہ زمزم نہ رسد

ملاحظہ فرمائے آپ نے اس موقع پر لفظ ''قوم'' کے تیور اور تیکھے معنی۔

لفظ ''قوم'' کو دشنام کے معنی میں استعمال کرنا ایک ایسا عجیب تصرّف ہے کہ لغت اور لغت نویس، دونوں حیرت کے دریا میں غوطے کھاتے اور شور مچاتے نظر آرہے ہیں۔

O

یہ چند مثالیں تھیں اُن الفاظ کی جنہیں شعراء نے معروف لغوی معنی سے علیحدہ کر کے اس

طرح استعمال کیا ہے کہ لغت کی اوپر کی سانس اوپر ہو کر رہ گئی ہے اور نیچے کی سانس نیچے اب ان چند الفاظ پر نگاہ ڈالیے جنہیں شعراء نے ان کی گردنوں میں حلقہ ڈال کر اپنے پیچھے کھینچا اور توڑ موڑ کر اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ چند مثالیں اُردو زبان کے وسیع ترین شاعر میاں نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم "پری کا سراپا" میں سے پیش کی جاری ہیں اس مخمس کے ہر آخری مصرع میں "سجاوٹ وسی ہے" اور "لگاوٹ وسی ہے" پر ختم ہوتا ہے۔ واضح باد کہ ہماری زبان میں "وٹ" کا استعمال بہت محدود ہے۔ مثلاً "لگاؤ" سے ہم لگاوٹ" اور "میل" یا "ملنے" سے ہم "ملاوٹ" تو بنا لیتے ہیں لیکن "لیٹنے" سے "لٹاوٹ" یا "بیٹھنے" سے "بٹھاوٹ" نہیں بناتے اور کہیں کہیں اس "وٹ" کے عوض ہم "پن" سے کام لیتے ہیں جیسے "لچا" سے "لُچپن" اور "بانکا" سے "بانکپن" ۔۔۔۔۔۔ لیکن میاں نظیر اکبر آبادی نے الفاظ پر ماہرانہ تصرف کر کے اس "وٹ" کو جس خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے اس کی نظیر نہ ہمارے لغات مل سکتی ہے نہ ہمارے قواعد یعنی گریمر میں۔ ملاحظہ فرمایئے ذیل کے مصرعے۔ "پری کا سراپا" یوں بیان ہو رہا ہے۔

عیّار نظر ، مکّار ادا ، تیوری کی چڑھاوٹ وسی ہے
چتون کی دغا ، نظروں کی کپٹ ، سینوں کی لڑاوٹ وسی ہے

○

پنڈے کی لٹک ، جھمکے کی جھمک ، بالے کی ہلاوٹ وسی ہے
پانوں کی رنگاوٹ قہر ستم ، دھڑیوں کی جماوٹ وسی ہے

○

پہونچی کی پہنچ پہنچے پہ غضب ، بانکوں کی بندھاوٹ وسی ہے
گالی وہ بلا ، تالی وہ ستم ، انگلی کی نچاوٹ وسی ہے

○

قہ قہ کی ہنساوٹ اور غضب ، ٹھٹھوں کی اُڑاوٹ وسی ہے
بانہوں کی جھمک ، گھونگھٹ کی ادا ، جوبن کی دکھاوٹ وسی ہے

○

بالوں کی دمک ، چوٹی کی جھمک ، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے
دائیں کی مُڑت ، بائیں کی ابھرت ، مونڈھوں کی کھچاوٹ ویسی ہے

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ صرف ان دس مصرعوں کے اندر نظیر کے ملکۂ سخن نے لغت وقواعد کو پیچھے چھوڑ کر الفاظ کو کس طرح توڑ مروڑ کر وہ معنی پیدا کئے ہیں جو اور کسی صورت سے بھی ظاہر نہیں کئے جا سکتے تھے۔۔۔۔ چڑھاوٹ، لڑاوٹ، ہلاوٹ، جماوٹ، بندھاوٹ، نچاوٹ اڑاوٹ، دکھاوٹ، کھلاوٹ اور کھچاوٹ سے نظیر نے جس طرح مختلف اور بے نظیر کیفیات کا اظہار کیا ہے یہ ان ہی کا حصہ تھا اور ایک شاعر کی حیثیت سے وہ ہی اور ان کے ہم مرتبہ شعراء ہی الفاظ سے اس طرح کھیل سکتے ہیں اور یہ وہ الفاظ کی خدائی ہے جو شاعروں کے سوا اور کسی کے حصے میں نہیں آئی ہے اور نہ آ ہی سکتی ہے۔

(۱۹۵۹ء)

○

دو بج کر ۲۵ منٹ صبح
۶۶-۷-۴، کراچی

ابوالعالمین

اَنا کا بھنچاؤ، تمام بُرائیوں کی جڑ، اور اَنا کا پھیلاؤ، ہر نیکی کی بنیاد ہوتا ہے۔ اَنائے مجزوی اپنی ذات کے خول سے کبھی نہیں نکلتا، اور اَنائے کلّی اِس کرۂ ارض ہی کو نہیں تمام انفس و آفاق اور پورے نظامِ شمسی کا احاطہ کر لیتا ہے۔

فکر کے اس نقطۂ معراج تک پہنچ کر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اسماء، اجسام اور اشکال ایک اضافی و فرضی چیز ہیں، اور ایک ایسا عالم عینیت ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہے، جہاں غیریت کا تصور بھی محال ہے اور زمین ہو کہ آسماں، ذرات ہوں کہ نجوم، نور ہو کہ نار، جمادات ہوں کہ نباتات، جانور ہوں کہ انسان یہ سب کے سب، ایک ہی جوہر سے معرضِ وجود میں آئے اور سب کے سب ایک ہی خاندان کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس حلقۂ عینیت میں داخل ہو کر یہ بات قطعی طور پر ناممکن ہو جاتی ہے کہ آدمی، اس عالم کون و فساد میں کسی ایک آدمی سے بھی نفرت کر سکے۔ بلکہ، اس کے برعکس اس کے واسطے یہ امر ناگزیر ہو جاتا ہے کہ وہ تمام موجوداتِ عالم سے بالعموم اور تمام نوعِ انسانی سے بالخصوص، محبت، شدید محبت اور خود اپنی ذات کی طرح محبت کرے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے دانائے اسرار کو برائی سے شدید نفرت ہوتی ہے، لیکن بُرائی سے نفرت کے باوجود، وہ بُروں سے نفرت نہیں کرتا، وہ امراض کو ختم کر دینا چاہتا ہے، لیکن مریضوں کی تیمارداری کرتا ہے اور اس کی محبت کی لے یہاں تک بڑھ جاتی کہ وہ اپنے دشمنوں تک کو چاہتا اور کلیجے سے لگا لیتا ہے اور دل ہی دل میں کہتا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں۔

لیکن جب وہ دشمن سے محبت کرتا ہے تو بھولے سے بھی اس بات پر نہیں اتراتا کہ اللہ اکبر میں کس قدر عظیم انسان ہوں کہ دشمنوں تک کی خطائیں معاف کر دیتا ہوں۔ اور اس عدمِ افتخار کی علت یہ ہوتی ہے کہ وہ دشمن کو خاطی ہی نہیں سمجھتا ہے، اور اس بناء پر خاطی نہیں سمجھتا کہ اس کو یہ علم ہوتا ہے کہ ہر خطا نتیجہ ہوتی ہے کسی شدید نفسیاتی بیماری کا اور جو فعل کسی بیماری سے پیدا ہوتا ہے وہ ارادی نہیں، اضطراری ہوتا ہے، اور اس لئے اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اضطراری فعل کو ارادی سمجھنا، اور اس کو لفظ معافی سے منسوب کرنا صرف دانش مندی اور معدلت گستری ہی کے خلاف نہیں، بلکہ فطرتِ انسانی کے ساتھ ایک جاہلانہ گستاخی بھی ہے۔

ارتقاء کے اس ابتدائی دور، اور انسان کے اس طفلانہ زمانے میں ایسے انسان کے پیدا ہونے کی توقع نہ رکھنا چاہیئے، لیکن اگر کسی خوش قسمت اللہ کے بندے کو ایک ایسا انسان کہیں سے مل جائے تو میں اس خوش قسمت آدمی سے بڑی گھن گرج آواز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اے میرے وہم پرست بھائی اس کو دیکھ کر اس ایشیائی مغالطے میں ہرگز نہ پڑ جانا کہ وہ شخص فرشتہ خدا رسیدہ پیغمبر یا اوتار ہے بلکہ اس کی بابت یہ رائے قائم کرنا کہ وہ انسان ہے، ایسا مکمل انسان جس کو وہ نایاب دولت حاصل ہوتی ہے جس کو صحتِ عقل کہا جاتا ہے، اور صحتِ عقل ہی درحقیقت وہ تنہا شرف و مجد ہے جو انسان کی پیشانی پر رحمۃ اللعالمین کا تاج کج کر کے، اس کو اسقدر ناقابلِ تصور بلندی عطا کر دیتا ہے کہ اس کی عَبدیت، مَعبودیت معلوم ہوتی ہے، اور اس ابنِ آدم پر اِلٰہُ العالمین ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

(مضمون کا اختتام ۲۴ بج کر ۱۲ منٹ)

خانۂ تاباں، خورشید علی خان
نارتھ ناظم آباد، کراچی

صبح دیر سے بیدار ہونے پر

آج سوتا رہا میں دیر تلک
روسیہ نیند پہ خدا کی مار

آج بھی پی سکا نہ آنکھوں سے — بادۂ نابِ صحتِ افکار
آج بھی رُوح میں نہ گونج سکی — دف و چنگ و شعور کی جھنکار
آج بھی ڈھونڈتی رہی مجھ کو — طائرانِ صبوح کی چہکار
آج بھی حیف ہو گیا برخواست — لیلیٰ رقص و رنگ کا دربار
آج بھی حیف تا بدیر، مسیح — کھٹکھٹاتے رہے درِ بیمار
آج بھی ذہن میں جھنک نہ سکا — منھ اندھیرے کی خامشی کا ستار
آج بھی نیند نے تلف کر دی — حُسنِ فطرت کی دولتِ بیدار
آج بھی سرنگوں رہا مجھ بن — نازِ الوان و عشوۂ اشجار
آج بھی کنج میں اُداس رہی — نکہتِ زلفِ دخترانِ بہار
حیف دوشیزگانِ مشرق سے — آج بھی ہو سکا نہ بوس و کنار
آج بھی کھل نہ پائے سینے میں — غرفہ ہائے ثوابت و سیّار

آج بھی سُن سکا نہ جھونکوں سے — لہجہ ہائے پیمبرانِ کبار
آج بھی دل پہ چل گئی برچھی — آج بھی سَر پہ چل گئی تلوار
آج بھی تا بہ شام وائے نصیب — سطحِ جودت رہے گی ناہموار
چاہِ غفلت سے ہائے کب نکلا — لُٹ گیا جب یہ مصر کا بازار
حُسن کے قافلوں پہ قافلے آئے — اور جاگا نہ قافلہ سالار
لائی تھیں گوندھ کر جنہیں حوریں — حیف گردن میں پڑ سکا نہ وہ ہار
جل رہے ہیں الاؤ سینے میں — ڈھلتا رہتا عذابِ انتظار
نہ کیا کعبۂ سحر کا طواف — تف ہے اے جوشِ حُسن کے غدّار
تُجھ پہ اے بختِ نارسا لعنت — تجھ پہ اے خوابِ ناسزا پھٹکار
تُو نے لٹھا کیا بہت لٹھا — اے سیاہ صبائے زمزمہ بار
کر رہا جوشؔ بے بصیرت پہ — ٹھوکروں کے لگا دیئے انبار

(جون ۱۹۷۹ء)

○

رُباعی

دولت ارض و سما کی کھو دیتا ہوں
دل کو یمِ اشک میں ڈبو دیتا ہوں
ملتی ہے سُہاگ اپنا بڑھائے ہُوئے صبح
جب دیر سے اُٹھتا ہوں تو رو دیتا ہوں

○

طویل ترین غیر مطبوعہ نظم
حرفِ آخر
سے ایک اقتباس

ارتقاء کا اعلان

بہادرو، وہ خم ہوئیں بلندیاں، بڑھے چلو
پئے سلام جھک چلا وہ آسماں، بڑھے چلو
فلک کے اُٹھ کھڑے ہُوئے وہ پاسباں، بڑھے چلو
یہ ماہ ہے، وہ مہر ہے، یہ کہکشاں، بڑھے چلو
لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں، بڑھے چلو

تمہارے زیرِ اقتدار، کارِ مہر و ماہ ہے
تمہاری ذات، اصل میں اُلوہیت پناہ ہے
تمہارا دل رسولؐ ہے، تمہارا ذہن اِلٰہ ہے
بس اک نفس کی دیر ہے، بس اِک قدم کی راہ ہے
ستارہ بار و مہ چکاں و خورفشاں، بڑھے چلو

ابھی یہاں نہ حور ہے نہ خلدِ بے عدیل ہے
نہ طائروں کے چہچے میں بانگِ جبرئیل ہے
نہ سیم و زر کے قصر ہیں نہ موتیوں کی جھیل ہے
نہ اوجِ آب و رنگ ہے نہ موجِ سلسبیل ہے
ہنوز دہر کا لقب ہے خاکداں، بڑھے چلو

تمہاری جستجو میں ہیں رواں جہاں پناہیاں
فلک کی شہریاریاں، زمیں کی کج کلاہیاں
تم اور بساط بے دلی پہ دل شکن جمائیاں
ہر اک قدم پہ ہیں، توہمات، تباہیاں، سیاہیاں
تباہیوں، سیاہیوں کے درمیاں بڑھے چلو

ابھی تو دستِ آدمی میں تیر ہے، کمان ہے
زمیں ابھی لڑائیوں، شرارتوں کی کان ہے
ابھی تو طفلکِ حیات نو برس کی جان ہے
مزاج چھوئی موئی ہے، دماغ دھان پان ہے
نہیں ہوئی ہے زندگی ابھی جواں، بڑھے چلو

ابھی نشاں ملا نہیں ہے منزلِ حیات کا
ابھی تو دن کے ولولے میں وسوسہ ہے رات کا
ابھی لیا نہیں ہے دل نے جائزہ حیات کا
ابھی پتا چلا نہیں ہے سِرِّ کائنات کا
ابھی نظر ہوئی نہیں ہے رازداں بڑھے چلو

وہ عرش ہے، یہ فرش ہے، وہ وہم، یہ خیال ہے
نہ وہ کشادہ دام ہے نہ یہ نہفتہ جال ہے
نہ وہ بُرا شگون ہے نہ یہ خراب فال ہے
تمہاری راہ روک لے کسی کی کیا مجال ہے
زمیں ہی سنگِ راہ ہے نہ آسماں، بڑھے چلو

زمیں کے طول و عرض پر ہیں غم کی تھرتھراہٹیں
بکھری ہُوئی ہیں دہر میں وباؤں کی کہانیاں
علی الدوام گھل رہی ہیں زیست کی کمانیاں
ہنوز زندگی پہ ہیں اجل کی حکمرانیاں
حیات ابھی نہیں ہُوئی ہے جاوداں، بڑھے چلو

ابھی تو خاک کی کلی چٹک کے مُسکرائی ہے
زمیں پہ لیلیٰ خودی ابھی تو گنگنائی ہے
ابھی تو فرشِ خواب پر حیات دسمائی ہے
ابھی تو اس زمین پر خدا ہی کی خدائی ہے
ابھی تو تم پہ عبدیت کا ہے گماں، بڑھے چلو

گلوں میں، اور خار میں، خزاں میں اور بہار میں
فضائے لالہ رنگ میں، ہوائے مشک بار میں
خروشِ برق و رعد میں سرودِ آبشار میں
ازل کے دن سے آج تک بشر کے انتظار میں
کھڑی ہیں کائنات کی جوانیاں، بڑھے چلو

ابھی تو قصرِ زندگی کی نیو ہے حباب پر
نہ سنگِ سطحِ خاک پر، نہ مہرِ موجِ آب پر
نہ حلقہ ہائے وقت میں، نہ قبضہ ہے شباب پر
نہ پاؤں ماہتاب پر، نہ ہاتھ آفتاب پر
ابھی تو آسمان پر ہے کہکشاں، بڑھے چلو

قریبِ ختم رات ہے، رواں دواں سیاہیاں
سفینہ ہائے رنگ و بُو کے کھل رہے ہیں بادباں
فلک ڈھلا ڈھلا سا ہے، زمیں ہے دُھواں دُھواں
اُفق کی نرم سانولی سیاہیوں کے درمیاں
مچل رہی ہیں زرنگار سُرخیاں، بڑھے چلو

O

سُہانی سزائیں

کیا اِک بُت کو پھر ماسورِ لطفِ بے کراں تُو نے
یہ مجھ پر کیا ستم ڈھایا خدائے اِنس و جاں تُو نے

محبت کے شرارے دے کے اک اُٹھتی جوانی کو
جلا ڈالا مری فرزانگی کا خانماں تُو نے

کسی نوخیز کے اُڑتے ہوئے آنچل کی جُنبش سے
اُڑا دیں میری جیبِ تمکنت کی دھجیاں تُو نے

متاعِ عقل کو میری نگاہوں میں سُبک کر کے
ملا دی خاک میں افکار کی جنسِ گراں تُو نے

انی دیکھی جو میری سینۂ آیات و افسوں پہ
تو دل کے پار کر دی ایک منگھوے کی سناں تُو نے

مرے آگے رُخ و گیسو کی دیواریں کھڑی کر دیں
مرا دھاوا جو دیکھا سوئے قصرِ لامکاں تُو نے

جو شمعِ ذات کو میں آندھیوں کی زد پہ لے آیا
مُسلط کر دیا آنکھوں پہ زُلفوں کا دھواں تُو نے

سبق لیتے مجھے دیکھا جو خار و خس کے مکتب میں
مُجھے اُلجھا دیا سرو و سمن کے درمیاں تُو نے

مجھے گرمِ عمل جب چلچلاتی دھوپ میں پایا
ہنکا دیں میری جانب گھڑ گھڑاتی بدلیاں تُو نے

جو کانٹے میری منطق کے چُبھے قلبِ عقائد میں
تو دے دیں پھُول سی باہوں کی مجھ کو بدھیاں تُو نے

نمد پوشی پہ قانع ہو گئی جب پختگی میری
تو میرے دوش کو دے دی قبائے پرنیاں تُو نے

مرے سینے کے شعلوں کو جو کجلاتے ہوئے دیکھا
تو اِک آنسو کے دل میں بھر دیا سوزِ نہاں تُو نے

مرے انفاس سے اٹھتی نہیں اب نکہتِ گل بھی
کیا ایسا نڈھال اے دشمنِ تاب و تواں تُو نے

مجھے آغوشِ تنگ و تیرہ بختائی میں بھینچا کر
مری فرزانگی کی توڑ ڈالیں پسلیاں تُو نے

جو میں گرجا سرابِ دیں کے متوالوں کی عقلوں پر
تو مجھ کو بخش دی موسیقیِ آبِ رواں تُو نے

جب آدھی رات میں طے کر چکا اقلیمِ حکمت کی
تو پہنا دیں مجھے زلفِ رسا کی بیڑیاں تُو نے

مقفل کر چکا میں درِ جب ایوانِ سماعت کا
تو نازل مجھ پہ کر دی اک انیلی نغمہ خواں تُو نے

مرا پتھراؤ جب دیکھا فرازِ عرش و کرسی پر
تو دل میں کھول دیں میرے نگینوں کی دوکاں تُو نے

جو میں نے صُلح کر لی کوزۂ قامت ذوقِ پیری سے
تو کڑکا دی مرے سر پر جوانی کی کماں تُو نے

برے طبل بغاوت کی گرج پہنچی جو تا گردوں
تو رشوت میں عطا کردیں کھنکتی چوڑیاں تو نے

جو آنچ آتے ہوئے دیکھی حرم کے آشیانے پر
تو بھر دیں جوش کے دل میں کروروں بجلیاں تو نے

○

اگر مُسلمانوں نے، خُودکشی کا عزم نہیں فرمالیا ہے!

اربابِ فکر کو بشرطیکہ انہوں نے خُودکشی کا عزم نہ فرمالیا ہو۔ اس بات پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا پڑے گا کہ یہ کیا بات ہے۔ کہ مسلمان قوم کے بالمقابل اس دنیا کی ہر مُتمدّن قوم میں عالموں، تندرستوں، دولت مندوں، خوش کرداروں اور دانش مآبوں کا اوسط بڑھا ہوا ہے اور اس آفتاب کے نیچے آج یہ بدبخت مسلمان جہاں کہیں بھی آباد ہے، ہر نہج اور ہر پہلو سے پراگندہ و برباد ہے۔

اور اس تین ساڑھے تین سو برس سے تو جہالت، جرائم، امراض، افلاس، غیبت، دروغ بافی، حسد، نفاق، اختلاف اور عقلی بے مائگی اس کے وجود پر اس طرح مسلط ہے کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ ان تمام رزائل نے مسلمان کو گود لے کر گویا اپنی فرزندی میں لے لیا۔ اور اپنا جانشین بنادیا۔

اگر اس پورے کرہ پر کسی ناقابلِ اعتناء حد تک کسی چھوٹے سے قریے میں بھی زیادہ نہیں۔ مٹھی بھر مسلمان ہی، مادی و ذہنی فراغت سے دوچار نظر آتے تو اس بربادئ تام و رسوائی عام کے گلیپے میں، ہر چند زبردستی ہی کے ساتھ سہی ایک استثناء پیدا کر کے مسلمانوں کی بربادی کے مسئلے پر

کسی دوسرے نقطۂ نظر سے غور کرنے کی گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔

لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ پاک و ہند ہی پر موقوف نہیں، اس زمین کے اوپر یہ مسلمان جس گاؤں، جس تحصیل، جس قصبے، جس شہر، جس ضلع، جس کمشنری، جس صوبے اور جس ملک میں بھی پایا جاتا ہے، اس شرمناک حالت میں گرفتار ہے کہ اسے دیکھ کر انسانی غیرت کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ اور انسانی ہمدردی کے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں ______ تو قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس بربادیٔ تام اور اس قتل عام کا سبب اور اس ہولناک معلول کی علت کیا ہے۔

ہم نہیں چاہتے کہ خدانخواستہ تمام اقوام ہماری طرح گرفتار بلا ہو جائیں لیکن دل میں یہ سوالیہ کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے کہ دیگر اقوام بہتر حالت میں کیوں ہیں۔ اور یہ سوچنے پر دماغ مائل ہوتا ہے کہ ہم آخر کس "بلاشرکت غیرے" قسم کے عیب میں گرفتار ہیں۔ کہ تمام مادی ذہنی بلاؤں نے سب کو امان دے کر ایک ہمیں کو اپنا وارث قرار دے لیا ہے اور ایک طور پر اس سے زیادہ عبرت ناک صورتحال یہ ہے کہ ہر چند تقریباً چار سو برس سے مسلمان اس مہیب زوال کے مرض میں گرفتار ہے۔ لیکن کوئی ایسا حکیم حاذق اس وقت تک نہیں پیدا ہوا ہے کہ وہ اس مرض کی تشخیص کر سکے۔

شاید اس مرض کو مسلمان اس طرح اپنی صحت کا ایک "منجو ولاینفک" تسلیم کر چکا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اس تشخیص کی طرف مائل ہونے کی زحمت برداشت کرنے پر اپنے کو مکلف ہی نہیں سمجھ رہا ہے اور اس صورتحال سے بھی کہیں زیادہ یہ بات سر پیٹنے کے قابل ہے کہ اس مسئلے پر جو کچھ کہ "لال بجھکڑوں" نے غور فرمایا ہے وہ سراسر غلط ہے یعنی ان "خطرۂ ایمان" قسم کے لوگوں کے نزدیک مسلمانوں کے عالمگیر زوال کی یہ علت ہے کہ انہوں نے شریعت کی اتباع سے روگردانی کر لی ہے ______ اور اسی بناء پر "نماز پڑھو" نماز قائم کرو' نماز کھڑی کرو' حج کرو' روزے رکھو اور اللہ سے ڈرو' کے نعروں سے یہ فضاء آج گونجی ہوئی ہے۔

کاش ان حضرات کو معلوم ہوتا کہ اٹھارویں صدی میں ہندوستان، ایران، اور ترکی میں جب کہ اتباع شریعت کا دور دورہ تھا اور یہاں تک کہ مسلمانوں کی فوجیں مولویوں سے "حرز جان" کے

تعویذ لے کر میدان جنگ میں جایا کرتی تھیں عین اس دورِ صلاح وتقویٰ میں دوسری قوموں نے مسلمانوں کو ایسی شکستیں دیں تھیں کہ ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

اس کے دوش بدوش اگر شریعت کا اتباع ہی اس حیات عارضی کے تمام مشکلات کا حل ہوتا تو حضرت سرور کائناتؐ نہ تو مجلس شوریٰ قائم کرتے، نہ فوجوں کی بھرتی اور تنظیم ہی، نہ اسلحہ فراہم کیئے جاتے نہ سُفراء و عمال ہی کا تقرر ہوتا اور نہ غزوات وہجرت ہی پر عمل کیا جاتا اور صرف نمازوں، درودوں اور دُعاؤں سے مدد لے کر اپنی حفاظت اور اسلام کی اشاعت کا ساز و برگ مہیا کیا جاتا۔ ہر چند شریعت کا اتباع وہ چیز ہے کہ اس کا منکر کافر اور اس کا تارک گناہ گار فاسق ہوتا ہے۔ اور اس چیز کو ترک کر کے مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں رہ سکتا۔

لیکن وہ افراد جو نفس پیغمبر اور روح قرآن سے واقف ہیں ان کے نزدیک شریعت کا اتباع نصف اسلام ہے۔ کُل اسلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اسلام دراصل ایک گاڑی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے مادی وروحانی دو پہیوں پر قائم کیا تھا۔

رُوحانی پہیے کا نام ہے "اتباع شریعت" اور مادی پہیے کا نام ہے "مطالعۂ فطرت" اور یہ دونوں پہیے افادیت کے نقطۂ نظر سے اس قدر مساوی حیثیت سے اہم اور ہم قامت ہیں کہ اگر ان میں سے ایک پہیے کو نکال دیا جائے تو اسلام کی گاڑی غیر متحرک و جامد قسم کی ایک مضحکہ انگیز سی چیز بن کر رہ جائے گی۔ اور چونکہ تقریباً چار سو برس سے مسلمان نے اس دوسرے پہیے کو گاڑی سے نکال کر دور پھینک دیا ہے اور اسلام کو قابل مضحکہ خیز چیز بنا چکے ہیں۔ اس لئے اس زبردست زوال کے مرکب لنگ بنے ہوئے، زندگی کو بھوگ اور اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔ لوگوں میں اتنی عقل نہیں کہ اس بات کو سمجھ لیں کہ ایمان اور شریعت دعا و پرہیز ہے۔ جس کا زیادہ تر تعلق آخرت سے ہے اور تفکر ومطالعہ فطرت، دوا و غذا، جس کا تمام تر تعلق اس دنیا سے ہے۔

اگر مسلمان کے جناب میں "فلاحِ دارین" کا تصور باریابی کے قابل ہو اور اعتدال کو "خیرالامور" سمجھنے پر اپنے کو آمادہ کر سکتا ہو تو دونوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑے گا ______ ورنہ وہ گھڑی آ چکی ہے کہ وہ اس صفحۂ ہستی سے محو و مفقود ہو کر رہ جائے گا۔ مطالعہ فطرت کی اہمیت کے

سمجھنے اور اسے اتباعِ شریعت کے برابر درجہ دینے کی خاطر مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آیات قرآنی کا دیدہ وری کے ساتھ مطالعہ کریں۔

قرآن نے ''آیاتِ الٰہی'' یعنی مظاہر فطرت کے مطالعہ اور مشاہدے کی بڑی شدومد کے ساتھ ایک دو بار نہیں بار بار دعوت دی ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے فائدے کی خاطر ان مظاہر پر غور وفکر کریں۔

اللہ تعالیٰ حکیم ہے وہ تلعب کو نہ اپنے واسطے اور نہ مسلمانوں ہی کے لئے پسند فرماتا ہے۔ اس لئے اس دعوت کے پردے میں یہ منشائے الٰہی تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ مظاہر قدرت یعنی شمس وقمر، نجوم وذرات، ارض وسماء، دشت ودریا، اشجار وکوہسار ظلمت ونور، لیل ونہار، طلوع وغروب، ثمر وگل، ابروباد، برق ورعد، جمادات وحیوانات، قوس وقزح اور کہکشاں کا تماشہ کھیل کود کے واسطے کیا جائے اور مسلمان طلوع وغروب کی سنہری دھاریوں، تاروں کی روپہلی چھاؤں، دریاؤں کی سیال انگڑائیوں، روزہائے تیرکی جنوں فروشیوں اور شبہائے ماہ کی کافرما جرائیوں میں گم ہوکر شاعروں کی طرح خواب آور بانسریاں بجائیں اور رندانِ خرابات کے مانند دیوانہ وار رقص فرمائیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس دعوتِ فکرو مشاہدۂ فطرت کے پردے میں خدا مسلمانوں کو اس امر کا حکم دیتا ہے کہ وہ

(۱)---------- آیات پر غور کریں ان کے حسن وجمال سے متاثر اور ان کے نظم وانتظام سے آگاہ ہوکر اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے ایمان کو تازہ کریں۔ اور محکم بھی بنائیں۔

(۲)---------- ملحدانہ افکار کی سپاہ کا مقابلہ کرنے کے واسطے اپنے کو منطقی اور سائنٹفک براہین سے مسلح کریں۔

(۳)-------- عقلی میدان میں اتر کر اسلام کی تبلیغ کریں اور اسلام کی صحت پر ایسے محکم دلائل پیش کریں کہ غیر مسلم ایمان لے آئیں اور رفتہ رفتہ اس پورے کرۂ ارض پر ایک ایسی متین وصالح سوسائٹی کی بنیاد پڑ جائے جو اسلامی یا کم از کم اسلامی نمونے پر قائم ہو۔

(۴)-------- مسلمان آیاتِ الٰہی (مظاہر قدرت) کی فردیت، مجموعیت اور ان کے باہم دگر

پیچیدہ رشتوں کو ٹٹولیں اور سلجھائیں ان کی تمام شکنوں اور سلوٹوں کی پرتیں کھولیں ان کے مظروفات اور مستورات کا جائزہ لیں۔ عناصر کو اس طرح بجا کر دیکھیں جس طرح کھرا کھوٹا سکہ جانچا جاتا ہے۔ ان کے مزاج کو پہچانیں۔ ان کے اجزائے ترکیبی کو ایک ایک کر کے شمار کریں اور ان کے خواص کو تولیں ان کی خاصیت و آمیزش کو پرکھیں اور ان کے اسرار خانوں کے قفل اور ان کی بحرمانہ دست آویزوں کے لفافوں کی مہروں کی توڑیں اور ان کے ہم رنگ و متضاد اجزاء کو ملا اور جدا کر کے دیکھیں ان کے اطاعت قبول و بغاوت آمادہ میلانات کی رگوں کا خون لیں اور اس کو جانچیں اور اس تمام مفکرانہ و مومنانہ جہاد کے بعد تمام قوائے کائنات کو مکمل طور پر مسخر کر کے انکی اکڑی ہوئی گردنوں میں عزائم انسانی کی غلامی کا طوق ڈال دیں۔

(۵)--------اور فطرت کو اس طور سے شکست دے کر اس کے مال غنیمت کو حیات انسانی کے تمام جہاد سیاسی عالم گیر فیاضی اور ایسے دیدہ ورانہ تناسب کے ساتھ تقسیم کر دیں کہ زندگی کا ہر شعبہ مالا مال و تابناک ہو جائے اور حیات عارضی کی پیشانی لو دینے لگے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر قوم اور حیات کے ہر روپ پر نعمتوں کی ایسی موسلا دھار بارش کر دیں کہ حیوانات و نباتات اور جمادات تک کے سینے میں ٹھنڈک پڑ جائے اور دنیا کا ہر ذرہ اس امر کی شہادت دینے لگے کہ بیشک اسلام کا پیغامبر سچ کہتا تھا کہ وہ رحمت اللعالمین ہے۔

مسلمان اگر اس امر پر مُطلع ہونا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانۂ عروج میں شریعت و فطرت کو مخلوط و مفروج کر کے اس آدھی دنیا کو کس طرح زیر نگیں کر چکے ہیں۔ تو نول کشور کے مطبع کی بادامی کاغذ پر غلط چھپی ہوئی سستی ادعیۂ و عملیات کی کتابوں کے شوق سے دستبردار ہو کر قرآن اور مستند تاریخوں کا مطالعہ کریں۔

واضح باد کہ مسلمان اپنے زریں دور میں خیرُ الامور (اعتدال) پر اس سختی کے ساتھ قائم تھے کہ ایک طرف تو پختگی ایمان و اتباع شریعت میں اس بلا کا انہماک تھا کہ ان اعمال میں خلوت و جلوت کا کوئی فرق ہی باقی نہ رہا تھا اور دوسری طرف تفکرات و تعقل اور مشاہدۂ فطرت میں وہ اس قدر غلو کرتے تھے کہ ہر جنبش نظر میں انہیں سو رکعتوں کا ثواب حاصل ہوتا رہتا تھا۔ اور اس دینی و دنیوی

تصورات کی اعتدالیت وہم آہنگی کی یہ برکت تھی کہ اس اپنے عروج کے زمانے میں۔

(۱)--------- مسلمانوں کی بحری و بری برتری کی طاقت کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور وہ خشکی وتری، جدھر بھی رخ کرتے تھے، پہاڑ اور سمندر ان کے راستے سے ہٹ جاتے تھے۔

(۲)--------- صنعت و حرفت، تجارت و کاروبار، زراعت و باغبانی، درآمد و برآمد اور سفرو سیاحت کو وہ فروغ حاصل تھا کہ دنیا کے ہر گوشے میں انہیں سرفرازی اور سربلندی حاصل تھی۔

(۳)--------- غیر مسلموں (ذمیوں) کے ساتھ ان کا برتاؤ اس قدر عادلانہ وفیاضانہ تھا کہ آج اس بیسویں صدی کی تہذیب کو بھی اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔

(۴)--------- شہروں کی صفائی، امن وامان کی استواری، جرائم کی بیخ کنی کا یہ عالم تھا کہ خود یورپی سیاح اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اس وقت یورپ کا کوئی شہر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

(۵)--------- عدالت (محکمہ قضاء) کے نزدیک شاہ وگدا مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس کے احاطے میں کسی مقتدر ترین فرد کا اثر بھی باریاب نہیں ہو سکتا تھا۔

(۶)--------- فنونِ لطیفہ کو اس قدر فروغ دیا گیا تھا اور اربابِ فن کو اس طرح سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا کہ اس سے قبل اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔

(۷)--------- فنِ طب اور شعبہ جراحی کی دل کھول کر سرپرستی کی جاتی تھی۔ امراض کی تشخیص اور نبض کی رفتار پر اس درجہ عبور حاصل کر لیا گیا تھا کہ طبیبوں کی اُنگلیاں ایکسرے کا کام کیا کرتی تھیں اور یہ بات بھی مسلمانوں کے علم میں آ چکی تھی کہ بہت سے امراض کا موسیقی کی لہروں سے ازالہ کیا جا سکتا ہے۔

(۸)--------- ہیئت، نجوم، جغرافیہ، تاریخ اور الجبرا کو ایسی ترقی دی گئی تھی کہ جس کی زمانہ سابق میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

(۹)--------- بڑے بڑے زبردست کتب خانے قائم کیے گئے تھے۔

(۱۰)--------- اس وقت تک کی سائنس پر بھی عبور حاصل کر لیا گیا تھا اور اس کی مدد سے آگ، بارود اور لوہے کے استعمال پر قدرت پیدا ہو گئی تھی۔ تاروں، بادلوں، موجوں اور ہواؤں کی رفتار بھی

جان لی گئی تھی آنے والے موسمی تغیرات کی پرچھائیوں کو فضاء میں پالیا جاتا تھا۔ سمندر کے سکون کی نبض میں آنے والے طوفان کی دھمک کو دیکھ لیا جاتا تھا۔ اور شہر سے دشمن کی فوج کس قدر فاصلے پر ہے اور زمین سے پانی کی سطح کس قدر نیچی ہے یہ بات زمین پر کان جما کر معلوم کر لی جاتی تھی۔

(۱۱) .... اور تمام یونانی فلسفہ جو اس وقت تنہا مشعلِ فکر تھا عربی کے سانچے میں ڈھال لیا گیا تھا جس کے زیرِ اثر فکر کے متعدد مکاتب معرضِ وجود میں آ گئے تھے اور بے شمار متکلمین، فلاسفہ نے اپنی عمریں اس کام لئے وقف کر دیں تھیں کہ مسلمان حسبِ دستور عقل کے استعمال اور قدرت کی تسخیر پر حسبِ دستور قادر و متصرف رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے زمانِ عروج میں مسلمان آگاہی و دانائی کی انجمن کا تنہا مسند نشین اتباعِ شریعت کے منبر کا تنہا خطیب، فنونِ لطیفہ کی سلطنت کا شہریار سیاسیات و معاشیات کے طاق کا تنہا چراغ، افقِ اندیشہ و افکار کا تنہا آفتاب اور سائنس کی طرفِ کلاہ کا تنہا طرۂ زرتار تھا۔ اور مسلمانوں کا زلہ ربا یورپ جو آج عالمِ اسلامی پر چھایا ہوا ہے اور ہماری بے عملی و جہالت پر سب سے زیادہ قہقہے لگانے میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ایک وہ بھی دور تھا کہ وہ مسلمانوں کے عملی و نظری گودام میں چوہوں کی طرح چپکے چپکے جاتا اور ان کے معلومات کے بوروں کو کتر کتر کر اپنے سوراخ میں جمع کیا کرتا تھا۔ لیکن آج ہم سیلی ہوئی بارود، جھلسے ہوئے کارتوس، بجھی ہوئی آگ، لٹی ہوئی جوانی، پھوٹی ہوئی تقدیر، ٹوٹی ہوئی کمر اور ڈوبی ہوئی نبضوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہ گئے ہیں ----

حیرت کی بات ہے کہ صرف تین چار سو برس کے اندر کس قدر عظیم تغیر رونما ہو چکا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے خوشہ چیں و سارق یورپ نے جب کروٹ بدلی اور نشاۃ ثانیہ کے بعد وہاں کے افق پر جس وقت جدید افکار و تازہ تحقیقات کی صبح انقلاب طالع ہوئی تو مسلمان، بدبختی کی بناء پر اس نئی روشنی سے بدظن ہو گئے۔ اور جوان آفتاب سے منہ پھیر کر ادھر دیکھنے لگے جہاں بوڑھے ماہتاب کو قبر میں اتارا گیا تھا۔

مسلمانوں نے متفقہ طور پر اس وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ یورپ کے اس نشاۃ ثانیہ کے لائے ہوئے انقلاب کے اثر کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ اور یہی چیز مسلمانوں کے زوال کی بنیاد بن گئی۔

یورپ کے نشاۃ ثانیہ سے قبل تک مشرق و مغرب دونوں واقعاتِ عالم کی تفسیر و تعبیر کی خاطر اپنے اپنے فلسفۂ حیات کی تحقیق میں سرگرم اور حوادث و واقعاتِ کائنات کے اسباب و علل کے تجسس میں دوش بدوش مصروف کار تھے۔

یوں تو فطرت کے مستند تعبیرات کے چھوٹے سرچشمے چین اور ہند بھی تھے لیکن اس کا سب سے بڑا سرچشمہ یونان تھا۔ جس کو عربی ذہن نے اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور یہ اسلامی فلسفۂ فطرت مغربی دنیا میں بھی عقلی بنیاد کے طور پر کام دیا کرتا تھا لیکن یورپ پر جب لیونارڈو ونچی (ون چی) اور بیکن کے سے چند غیر معمولی اربابِ فطانیت نے اثر ڈالنا شروع کردیا تو تعبیراتِ فطرت کے باب میں جو عربی تصورات تھے ان کی صداقت معرضِ اشتباہ میں آ گئی۔

اہلِ یورپ پر اس اشتباہ کا اس قدر گہرا اثر پڑا کہ آخر کار انہوں نے ان روایات سے روگردانی کرلی۔ جن کی صداقت کی صرف یہ ایک دلیل پیش کی جاتی تھی کہ ان پر ماہ و سال کے بہت کارواں گزر چکے تھے اور انہیں قدیم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اربابِ مغرب نے یہ طے کرلیا کہ وہ دوسروں کی آنکھوں سے نہیں بلکہ خود اپنی آنکھوں سے حوادثِ فطرت کا براہ راست مشاہدہ کریں گے۔ اور یہ فیصلہ ہوتے ہی قوانینِ فطرت کی جانچ پڑتال اسی جدید نہج سے شروع ہوگئی اور یہی طرزِ فکر تمام یورپ کی عقلی راہبری کا فریضہ انجام دینے لگا۔

لیکن مسلمانوں نے اس نشاۃ ثانیہ کے انقلاب کو تسلیم و قبول نہیں کیا، اور اس خلافِ قرآن وہم میں مبتلا ہو کر کہ شاید فطرت کے قوانین و حوادث کا خود اپنی آنکھوں سے براہ راست مشاہدہ کرنا ان کے عقائد کو متزلزل کردے گا، انہوں نے تجسس و تحقیقات کے واسطے اس راستے کا انتخاب کرلیا جو مغرب کے جدید جادۂ فکر کے قطعی طور پر برعکس واقع ہوا تھا۔

مسلمانوں کا صراطِ مستقیم سے یہ انحراف جہاں یہ ثابت کرتا ہے کہ انہیں اپنے عقائد اور ان کی سلامتی سے غیر معمولی محبت تھی وہیں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے تحت الشعور میں یہ خوف بکا ہوا تھا کہ ان کے عقائد کی بنیاد اس قدر مستحکم نہیں کہ وہ اس انقلاب کے دھارے میں باقی رہ جائے۔ افسوس کہ اس خطرناک تاریخی انحراف کے وقت مسلمانوں نے یہ نہیں سوچا کہ آیات

الٰہی کا براہ راست مطالعہ اگر وجود الٰہی کے ثابت کرنے سے عاجز و قاصر ہوتا تو خدائے حکیم انہیں ان آیات کے مطالعہ کی ایک بار دعوت نہ دیتا۔

بہر حال یورپ کے اس نشاۃ ثانیہ کے پیدا کردہ انقلاب اور مسلمانوں کے اس اندوہناک انحراف کے بعد مغرب و مشرق ہم جنس کے دو متضاد جادوں پر گام زن ہو گئے۔

مغرب حال کو جگا کر مستقبل کی طرف روانہ ہو گیا اور مشرق حال کو، سلا کر ماضی کی جانب گام زن ہو گیا۔

مغرب نے جدت پسندی اور عقل فروزی، کو اپنا شعار بنا لیا اور مشرق نے قدامت پرستی اور عقل سوزی کی عبا دوش پر ڈال لی۔

مغرب نے ترقی کرتے کرتے اپنے سوزوں پر جوہری توانائی کا خیمہ نصب کر لیا اور مشرق نے تنزل کرتے کرتے ناتوانی کے بورئیے پر اپنی سانس لیتی ہوئی لاش گرا دی۔

---------وہاں ترقی کے راستے کھل گئے، یہاں ترقی کا دور مسدود ہو گیا، وہاں نئی نئی ایجادیں ہونے لگیں، یہاں پرانی داستانیں دہرائی جانے لگیں، وہاں تعقل اور تعبد کو ہم معنی کر دیا گیا، یہاں عقلیت و ابلیسیت کو ہم زلف قرار دیا گیا، وہاں یہ سمجھا گیا کہ ارتقاء کے فیضان سے انسانی ذہن روز بروز بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور ماضی کے سربہ فلک قلعے آج بچوں کے گھروندے کی مانند ہیں۔ یہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ انسانی ذہن تنزل کی نحوست سے روز بروز پست سے پست تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسی بناء پر ماضی کے گھروندے آج قلعے نظر آ رہے ہیں۔ یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ تحقیق و تدقیق کی معرفت راہ نمائی کا حق صرف ماضی کو حاصل تھا۔ اور مستقبل کا لے دے کر صرف یہ ایک فریضہ رہ گیا ہے کہ وہ ماضی کا طوق غلامی پہن کر ایک وفادار کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ اور بس، نیز یہ کہ آیات الٰہی اور حیات دارین کے باب میں جس قدر سوچا جا سکتا یا جس قدر بھی سوچے جانے کا امکان تھا وہ سب کا سب سو فیصدی ماضی میں سوچا جا چکا ہے اب زمانہ حال و مستقبل میں کوئی اس نوعیت کی چیز باقی ہی نہیں رہ گئی ہے جسے "سوچنا" یا غور کرنا کہا جا سکے۔

ان تصورات نے یہ عقیدہ راسخ کر دیا ہے کہ ماضی کے ارباب علم، عقلی دیو اور فکری ابوالہول تھے اور ہم سب علمی طالب زاد تقلیدی بونے ہیں۔ اور اس عقیدے نے تماشہ دکھانا شروع کر دیا کہ علمی کھلونے اور تقلیدی بونے اپنے عقلی دیوؤں اور فکری ابوالہولوں کے کاندھے پر چڑھ چڑھ کر بیٹھنے لگے اور ہر نیا بونا پہلے بونے کے کاندھے پر سوار ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ ان بونوں کی مجموعی بلندی اس قدر رعب آفریں بن گئی کہ جہاں ان علامہ بونوں کے روبرو سر بسجود ہو کر رہ گئے اور پوری قوم موت کے انتظار میں چشم براہ گوش برآواز بن کر بیٹھ یا یوں کہیئے کہ لیٹ گئی۔

گھبرا کر سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مسلمان قوم بالعموم اور پاکستانی قوم بالخصوص جو صرف اسلامی ثقافت کے تحفظ و عروج کی خاطر ہندستان سے کٹ کر یہاں آباد ہوئی ہے۔ آخر قرآن کے بنیادی تصورات اور دارینی تعلیمات کی جانب اپنے تفکر اور اپنی ثقافت کی باگ کبھی موڑے گی بھی یا اس بھول بھلیاں میں سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے گی۔ کیا زندگی کی ساری برکتیں اور نا قابل احاطہ قوتیں قیامت تک غیر مسلموں ہی کے تصرف و اقتدار میں رہیں گی اور کیا ہمارے معاشرتی رسوم، روزانہ وظائف اور ذہنی مساعی کو اس کی قطعی کوئی احتیاج ہی باقی نہیں رہی ہے۔ کہ ان سب کو امکانی تہذیب و تمدن کی بلند ترین تشکیل و ہیئت سے ہم دوش و ہم آہنگ کر دیا جائے۔ کیا اس زمین و آسمان کے حوادث کی تحقیق و تعبیر اور ان کے اثرات کے تجسس سے ہم قیامت تک دستبردار ہی رہیں گے۔ اگر اس مزرع آخرت میں ایک دانا و بینا کاشتکار کی حیثیت سے زندہ رہنے کی تمنا کو اب تک حرام قرار نہیں دے دیا گیا ہے تو کان کھول کر وقت کی اس سب سے بڑی بات کو سننا اور سن کر گرہ میں باندھ لینا چاہیے کہ اس کارخانۂ عالم کا مستقبل سیاست پر نہیں۔ فلسفہ و ادب اور سائنس پر مبنی ہے اور اگر اس جواہر ثلاثہ پر مسلمانوں نے اقتدار حاصل کر لیا تو یہ کائنات ان کے قدموں پر جھک جائے گی اور قرآن کا یہ وعدہ کہ اگر مومن ہو تو اس زمین پر صاحب اقتدار بن کر رہو گے اور شمس و قمر کو مسخر کر لو گے بڑے شاندار طریقے سے ایفاء ہو جائے گا آخر میں ایک خطرے کی گھنٹی بجا کر اس عبارت کو ختم کیا جا رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تازہ ترین ایجادات اور جدید ترین وسائل نقل و حمل کی بناء پر

زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور وہ وقت دور نہیں رہا جب کہ ان آلات کی مزید ترقی کی بدولت ممالک و اقوام عالم کے درمیان جو صبر آزما فاصلے ہیں وہ موجود نہیں رہیں گے اور یہ دنیا اس قدر مختصر و متصل ہو جائے گی کہ تمام قومیں ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گی اور ہر قوم کو دوسری قوم کے تعاون اور جدید تحقیق سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ ہمارے قریب آنے والی قومیں چونکہ فلسفے، ادب، سیاست اور سائنس کے جدید نظریات، ایجادات اور انکشافات سے بہرہ مند ہوں گی۔ لوہے، تیل اور جوہری توانائی کے استعمال سے واقف، پیداوار کے جدید وسائل اسالیب سے آگاہ اور فکر و آئین حیات کے تازہ تقاضوں سے آشنا ہوں گی۔ اس بناء پر ان کا زاویۂ افکار، گفتار و کردار اور ان کا مزاج پاکستانیوں سے اس قدر مختلف بلکہ متضاد ہو گا کہ اگر پاکستانیوں نے اپنے تمام ذہنی و مادی تصورات کو ابھی سے بلکہ اسی لمحہ و ساعت سے جدید ترین سانچوں میں ڈھالنا شروع نہیں کر دیا تو ان آنے والی قوموں کا صف آراء مسابقت خواہ قُرب و اتصال بہت ہی قلیل مدت میں سب کو پامال کر کے رکھ دے گا۔ پاکستان کا قطرۂ شبنم ان شعاعوں کے روبرو آنِ واحد میں پرواز کر جائے گا اور جس طرح کہ گھن کی ضرب بے پناہ بلوریں چور چور ہو کر رہ جاتا ہے پاکستان ان سے مَس ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔

اس لئے قبل اس کے کہ اس قیامتِ ارض کا صور پھنکے اپنی زندگی کی مشین کے تمام کل پرزوں کی مرمت کر لو جو پرزے گھس کر ناکارہ ہو چکے ہیں ان کی جگہ نئے اور اصل پرزے لگا دو اور عصرِ حاضر کے لئے انجینئروں سے اس بات کی گارنٹی لکھا لو کہ اب تمہاری مشین ہر ٹکراؤ اور ہر تصادم کا بڑے استقلال سے مقابلہ کر سکتی ہے اور اپنی جسمانی اور روحانی فلاح کے واسطے ایک "پرورش گاہ فکر و قلم" (اکاڈمی آف تھاٹس اینڈ لیٹرز) قائم کر کے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس وقت سے میدان تبدیلی میں اتر آؤ کہ یہی ایک واحد ذریعہ ہے "تسخیر کشیر" کا۔

(۱۹۶۰ء، کراچی)

○

اِسلام ایک اصلاحی وانقلابی تحریک

جولوگ اسلام کی حقانیت اور اسلام کے پیش کردہ تصورِ اُلوہیت پر ایمان لا چکے ہیں ان کو سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام ادیانِ پارینہ کے مانند کوئی ٹونے، ٹونکے جادو گنڈے اور چھو منتر کا دین نہیں ہے۔

اِسلام شدت کے ساتھ ایک اصلاحی وانقلابی تحریک اور ایک معاشری ومدنی تہذیب و تنظیم کا نام ہے اور دیگر ادیانِ فرسودہ کی طرح وہ اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ محض چند رسوم کے ادا کرنے یعنی ایک خاص تہوار کے دن دریا میں ڈبکیاں لگا لینے یا ایک وقت مقررہ پر ایک خاص گوشے میں بیٹھ کر دس بار گھنٹی بجا دینے یا کسی گوشہ مقدس میں صبح وشام پاؤ پاؤ بھر لوبان سلگا دینے سے اللہ خوش ہو کر جزاء اور ان رسوم کو ادا نہ کیا جائے تو سزا دیتا ہے، خدائے اسلام کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ حکیم ہے اور اس کا کوئی قول وفعل حکمت سے خالی نہیں ہوا کرتا۔

اس کلیئے کو تسلیم کرنے کے بعد جب ہم اسلام کے اوامر ونواہی اور اس کے زہد وفقہ، حق و باطل، خیر وشر اور حلال وحرام وغیرہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے کو بجا طور سے یہ تسلیم کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ ان تمام احکام واُمور کی پشت پر کوئی نہ کوئی حکمتِ بالغہ ضرور کارفرمائی کر رہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس حکمتِ بالغہ کا تعلق اللہ سے ہے یا بندوں سے، اگر اللہ سے اس کا تعلق ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بندوں کی فرمابرداری سے اللہ کو فائدے، اور ان کی نافرمانی سے اللہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن خدا کی نفع آلودگی ونقصان رسیدگی کے تسلیم کر لینے میں سب سے بڑی قباحت یہ پیش آتی ہے کہ اس عقیدے سے اسلام کے پیش کردہ تصوّرِ اُلوہیت پر اس قدر کاری

ضرب پڑتی ہے کہ اس کی بے نیازی اور اس کی اکملیت پاش پاش ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ سرے سے خدا ہی باقی نہیں رہتا ہے۔

اس لئے ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بندے اور صرف بندے ہی ہیں جن کو فرمانبرداری سے فائدہ اور نافرمانی سے نقصان پہنچتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خدائے حکیم نے مریض انسانیت کی شفا کے واسطے ایک نسخہ ''اوامر و نواہی'' تحریر فرمایا ہے۔ اور چونکہ ہر نسخے کے دو مکتوبی و منقولی اجزاء ہوتے ہیں اس لئے اس کے مکتوبی جزو کو ''دوا'' اور منقولی جزو کو ''پرہیز'' کہا جاتا ہے۔ دوا کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کی دافع مرض طبیعت کو مدد پہنچا کر اس کو صحت کی جانب لے آئے اور پرہیز کا فائدہ یہ ہے کو وہ جسم انسانی میں ایسے اجزاء کے داخلے کو روک دے جن سے طبیعت کے اندفاعی اور دوا کے شفائی عمل پر برا اثر پڑتا ہے------ اس بات کے بیان کر دینے کی ضرورت نہیں اگر کوئی مریض دوا اور پرہیز سے جی چُراتا ہو تو اُس کے اِس عمل سے خود اُس کو ضرر پہنچتا ہے۔ طبیب کی صحت پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے۔

اس نکتے کو ذہن کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجئے کہ جس طرح دوا پرہیز مقصود، بالذات چیزیں نہیں بلکہ وسیلہ و ذریعہ ہیں۔ اعادہ صحت کا، بالکل اِسی طرح اسلام کے تمام اوامر و نواہی، اور جملہ تکلیفاتِ شرعیہ بھی مقصود بالذات چیزیں نہیں بلکہ وسیلہ و ذریعہ ہیں آدمی کے انسان اور انسان کے صاحب خیر حد تک شریف ترین انسان بن جانے کا۔

لیکن یہ دیکھ کر کبھی ہنسی آتی ہے اور زیادہ تر رونا کہ مسلمان، اس خطرناک مغالطے میں مبتلا ہو کر کہ نتائج۔ طاعت نہیں، بلکہ نفسِ طاعت ہی مقصود بالذات ہے۔ ''وسیلے'' کو ''مقصد'' اور ''راستے'' کو منزل سمجھ کر ہاتھوں پر عمر عزیز کو گنوا رہے ہیں۔

بھدی سی بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں نگاہ سے دیکھیے تو موٹر اور طاعت میں بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ موٹر، موٹر کی خاطر معرض وجود میں نہیں لائی جاتی، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قطع مسافت کر کے صاحب موٹر کو اس کے دفتر یا کارخانے وغیرہ پہنچا دے، یہی طاعت کا ہے، طاعت کی خاطر عائد نہیں کی گئی ہے بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ وہ انسان کے نفس کو پاک

کر کے اس کو معاشرے کا ایک صاحب خیر فرد بنا دے۔

اگر کوئی شخص موٹر خریدتا ہے، لیکن اس کو ملاقات کے کمرے کی زینت بنا کر ایک گوشے میں رکھ دیتا ہے۔ اور ہر چند اس پر روز پالش کرتا، اس کو ہاروں سے سجاتا اور اس میں لوبان سلگا کر بیٹھ جاتا اور عاشقانہ گیت گاتا رہتا ہے لیکن اس کو کبھی چلانے کا تصور بھی نہیں کرتا تو کیا آپ ایسے شخص کو پاگل نہیں سمجھیں گے؟

اسی طرح اگر کوئی شخص ہر روز پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور ہر سال تیسوں روزے رکھتا ہے اور ایک عدد حج کرتا ہے، لیکن اللہ کے بندوں کے حقوق کو انتہائی خلوص کے ساتھ غصب کرتا، تیموں کا مال کھاتا، سادہ لوحوں کو دھوکے دیتا اور ارباب محنت کے ماتھوں کا پسینہ چرا تا رہتا ہے۔ تو کیا آپ اس کو مرد صالح کہیں گے یا مرد منافق؟ اور اس کی طاعت کو طاعت کہیں گے یا مردم شکاری و فریب کاری؟ یا کم از کم مضحکہ خیز تضیع اوقات؟

اب آیئے اسلام کے تصور وحدانیت کی جانب۔ ہر چند اسلام نے اوامر و نواہی پر بے حد زور دیا ہے اور احکام خداوندی سے غفلت کرنے والوں کو شدید عذاب کی وعید بھی سنائی ہے۔ پھر بھی ان کو امکان نجات سے مایوس نہیں ہونے دیا ہے۔

لیکن وحدانیت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ مشرک پر نجات کے تمام دروازے بند کر کے، اس کی بخشش کے تمام احکامات کو ختم فرما دیا ہے۔

بڑے بڑے گناہگار، فرعون دوان کی حد تک کے گناہ گار کو تو بخشا جا سکتا ہے، لیکن مشرک کو، چھوٹے سے مشرک کو بھی کبھی اور کسی شرط کے ساتھ بھی بخشا نہیں جا سکتا۔ آخر اس انتہائی سزا اور اس بے نہایت قہر کی علت کیا ہے؟------------اس کی علت یہ تو ہو نہیں سکتی کہ گناہ گاری سے تو نہیں، لیکن شرک سے، خاکم بدہن، خدا کو براہ راست یا بالواسطہ نقصان پہنچ جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ اور نہ اس صورتحال کی یہ توجیہ و تاویل کی جا سکتی ہے کہ نعوذ باللہ خدا اور بندے میں عاشق و معشوق کا سا تعلق ہے اور تعلق کی بناء پر جب اس کا بندہ کسی دوسرے خدا کی جانب مائل ہو جاتا ہے تو عاشقانہ رشک کی بناء پر وہ اس کو ہمیشہ کے واسطے جہنم میں جھونک دیتا ہے۔ یہ دونوں تاویلیں

چونکہ اسلام کے پیش کردہ تصورِ الوہیت کی نفی کرتی ہیں اس لئے ان کی نامعقولیت کی بناء پر کوئی مسلمان ان کو قبول نہیں کرسکتا۔

تو پھر اس عذاب ابدی کی توجیہہ کیوں کر کی جاسکتی ہے؟

اس کی کھلی ہوئی علت یہ ہے کہ چونکہ تصورِ واحدانیت سے عظمتِ آدم اور وحدتِ نوعِ انسانی کی بنیاد پڑتی ہے اور چونکہ تصورِ شرک ایک ایسا زبردست گھن ہے جس کی ایک ضرب سے عظمتِ آدم و وحدتِ نوعِ انسانی کی عمارت ایک پل میں اڑ اڑا کر گر جاتی ہے۔ اس بناء پر شرک کو بدترین حرام قرار دیا گیا ہے اس کی سنگین ترین سزا تجویز کی گئی ہے۔

اس ابہام کی تفسیر یہ ہے کہ اپنے دورانِ اشراک انسان اپنے سر پر ہزاروں خداؤں کا بار اُٹھائے ہوئے تھا۔ وہ کالے سانپوں، گایوں، دریاؤں، سمندروں، بندروں، لنگوروں، پہاڑوں، ستاروں اور چاند سورج کو اپنا معبود گردانتا تھا۔ اور ان جھوٹے معبودوں سے اشرف ہونے کے باوجود ان سب کی چوکھٹوں پر ناک رگڑا کرتا اور شدید ترین احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اور جب اسلام نے آکر توحید کا آوازہ بلند کیا تو پہلی بار ہم کو یہ احساس ہوا کہ ہم جن قوائے کائنات کو اپنا خالق مانے ہوئے تھے وہ ہمارے خدا نہیں ہیں--------- تصورِ وحدانیت نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہم پر ان باطل خداؤں کا پول کھول دیا بلکہ ہم کو اس کا بھی یقین دلایا کہ ہم ان سب سے بمراحل ارفع واعلیٰ واقع ہوئے ہیں اور اس قدر کہ ہم ان سب کو مسخر کر لینے کی بھی طاقت رکھتے ہیں۔

اسلام نے ہم سے روشن ترین الفاظ میں یہ بات کہی کہ اے بندو! تم سب ایک خدائے واحد (توانائی مطلق) کے بندے ہو۔ صرف بندے نہیں اشرف المخلوقات ہو اور فقط اشرف المخلوقات ہی نہیں تم اس کرۂ ارض پر خدائے بزرگ و برتر کے خلیفہ بھی ہو۔

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

اے انسان یہ تمام قوائے کائنات تیرے مخدوم نہیں۔ خادم ہیں یہ تیرے خدا نہیں ہیں بلکہ بہ حکم خدا تو ان سب کا خداوند ہے۔ اور اے میرے بندے تجھ کو وہ شرف و مجد حاصل ہے کہ یہ پورا کرۂ ارض ہی نہیں بلکہ یہ تمام نظام شمسی تجھ سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ۔

همہ آهوانِ صحرا ، سرِ خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

تصورِ وحدت کی پشت پر عظمتِ آدم کے اعلان اور تسخیرِ کائنات کی بشارت کے ساتھ ساتھ ایک اس سے بھی عظیم تر حکمتِ بالغہ کار فرمائی کر رہی ہے۔ لیکن وہ ہنوز کلی کی شکل میں ہے۔ پھول بننے نہیں پائی ہے اور اس عظیم تر حکمت بالغہ کا نام ہے تصورِ وحدتِ نوعِ انسانی۔

جس وقت یہ کلی پھول بن جائے گی اس وقت انسانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ ایک مخدوم کے خادم، ایک آقا کے غلام، ایک صانع کی صنعت، ایک خدا کے بندہ، ایک کُل کے جزو، ایک غیب کے شہود اور ایک باپ کے بیٹے ہیں اور اس بناء پر انسانوں کے مابین غیریت کا نہیں عینیت کا رابطہ قائم ہو جائے گا۔

جس وقت انسانوں کے سامنے تصورِ واحدانیت کا یہ سب سے زیادہ روشن رُخ آ جائے گا اُس وقت انسان رنگ، نسل، وطن، قوم اور مذہبی تعصبات پر اب تک جس قدر خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں اپنا گریبان پھاڑ کر ماتم کرے گا اور اس جغرافیہ کے منہ پر تھوک دے گا۔ جو اس کو مختلف نسلوں اور مختلف قوموں میں تبدیل کر کے اس کے خون کے دھاروں کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے اس کو بے شمار ہلاکتوں میں ڈال چکا ہے۔

یہ وہ وقت ہو گا کہ پورا کرۂ ارض سمٹ کر ایک مکان اور پوری انسانیت مرتب ہو کر ایک خاندان میں تبدیل ہو جائے گی۔ اور انسانی خون کے دھاروں کو روکنے اور غلط سمتوں کی طرف موڑنے والے پہاڑ اپنے اپنے سروں کو جھکا لیں گے اور تمام اسلحہ کا لوہا گلا کر اُخوتِ نوعی و وحدت

انسانی کی ایک ایسی زنجیر ڈھال لی جائے گی جو قطبین کا محاصرہ کرلے گی اور تمام آفاق اس گل بانگ سے گونج اٹھے گا کہ۔

اقوام کے لفظ میں کوئی جان نہیں
اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مُشرکِ یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط
جو مُشرکِ انساں ہے وہ انسان نہیں

تابندہ باد چراغ ہیئت اجتماعی، زندہ باد عظمتِ آدم، پائندہ باد وحدتِ نوعِ انسانی۔

(اپریل ۱۹۶۳ء، کراچی)

خودکار پرورش گاہِ فکر و قلم پاکستان

(اسرارِ ترقی)

اگر قدرت کا یہ ایک آزمایا ہوا اٹل قانون ہے کہ جو قومیں امن دوستی، قانون نوازی، معاش کشائی، صحت افزائی، دفاع پناہی، تعلیم ورزی، ثقافت آرائی، لسان پروری اور فکر پرستی کی پرورش سے غفلت کا ارتکاب کرتی ہیں اُن کے جسم ذہن کے اندر ایک ایسا میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بیرونی فتنے کے بغیر ایک نہ ایک دن خود بخود برباد و ہلاک ہو کر رہ جاتی ہیں تو حکومتِ پاکستان سے یہ استدعا کرنا وقت کے اہم ترین تقاضے پر توجہ مبذول کرانے کی استدعا کرنا ہے کہ وہ تمام ملک کے اولیائے عمل و نظر کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک قومی دماغی وقف (National Brain Trust) کی بنیاد ڈال دے اور اس کی نگرانی میں ایک کروڑ روپے کے سالانہ سرمائے سے ایک ''خودکار پرورش گاہِ فکر و قلم پاکستان'' (Autonomous Academy of Thoughts and Letters) جلد سے قائم کر دے اور اسے مندرجہ ذیل دو شعبوں میں منقسم کر کے آغاز کار کی طرح ڈال دے۔

(الف)---------------شعبۂ صحتِ عقل

(ب)---------------شعبۂ وسعتِ زبان

شعبوں کے فرائض

(الف---------------شعبۂ صحتِ عقل

۱---------- عظمت عقل---------- نعرہ بازیوں کی بازاریت، جذبات پرستوں کی سفاہت، ہیجان پروریوں کی رنائت اور بنی بنائی رایوں کے چنگ لینے کی جہالت کو واضح کر کے نوع انسانی کو عقل کی افادیت و سعادت اور فکر کی عظمت و جلالت سے یوں آگاہ کرنا کہ وہ معقولیت سے وحشت و گریز کی وضع قدیم سے تائب ہو کر ایک منطقی طرز فکر اور سائنٹیفک دستور حیات کا خوگر و پابند ہو جائے۔

۲---------- ترتیب عقل---------- ماضی نواز و مستقبل گزار اشیاء کے جنوں فروز و عقل سوز ماحول و مزاج کی نمک پروردہ عقل کو جو انسان کے مضر مرغوبات، قبیح عادات اور غلط مُسلمات کو صحیح ثابت کرنے کے خبط میں مبتلا ہو کر ایک چالاک لیکن بے کردار مصاحب کے مانند ناخن فروش و بلال نما دلائل پیش کر کے اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہے، ایسے ماہرانہ تسلسل کے ساتھ تربیت دینا اور قوی بنانا کہ وہ انسان کی غلامی سے آزاد ہو کر اس پر فرماں روائی کرنے لگے۔

۳---------- ذکاوتِ بے لگام---------- بے وقفہ تواتر کے ساتھ گوشِ انسانی تک زندگی کے تجربوں کی یہ آواز پہنچاتے رہنا کہ کم نگاہ عبادت کے سو پربت بھی معاشرے کو اُس ہلاکت میں نہیں ڈال سکتے جن میں خود سر و گم راہ ذکاوت کی ایک رائی آسانی کے ساتھ ڈال سکتی ہے اس لئے کہ آزاد ذکاوت اُس تند و تیز مرکب کے مانند ہوتی ہے کہ اگر اس منہ زور کے دھانے میں سلیم عقل و دقیق فکر کی خاردار لگام نہیں لگائی جاتی ہے تو وہ اپنے راکب کو زمین پر گرا کر روند ڈالا کرتی ہے۔

۴---------- خیر العمل---------- دل و دماغ کی لوح پر اس اسمِ اعظم کا جلی حروف میں کندہ کرنا کہ تفکر و تعقل کے آلات و قویٰ کو استعمال کرکے ذہن و زندگی کو "خیر کثیر"[۱]---------- یعنی حکمت و سائنس کے سانچے

---

[۱] وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا پ. البقرہ۔ آیت ۲۷۰ (جوش)

میں ڈھالنا قدرت کی تمام پیچیدہ طاقتوں کی شکنوں کو کھولنا ان کے تمام حقائق وخواص سے آگاہ ہو کر قوائے کائنات کی تسخیر اور حیاتِ انسانی کی تکمیل کی آرزو اور اس آرزو کے بر لانے کے وسائل پر غور کرنا انسانی ذہن کا واحد خیر العمل اور نفس بشری کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

۵----------- تیقن و تجسس ----------- نفوس میں شدید تو ہ اور کرید کا مادہ وجوہر پیدا کرنا۔ کاہل وزود یقین دماغ کو محنت کوش و دیر یقین بنانا اور ذہن کو ایسی توانائی اور ایسا مزاج عطا کرنا کہ وہ یقین پر تجسس اور تقلیدی سکون پر تحقیقی اضطراب کو ترجیح دینے لگے۔

۶----------- عمل گاہ ----------- متعدد مقامات پر لے بوریٹریاں (Laboratories) قائم کرنا۔

۷----------- وظائف ----------- عام علوم کے واسطے سے بالعموم اور فلسفہ وسائنس کے لئے بالخصوص وظائف مقرر کرنا ہے۔

۸----------- تولیت تعلیمات ----------- محکمۂ تعلیمات کا احتساب کرنا، جبری و مفت تعلیم دینا، شہر اور قریے میں اسکول اور بورڈنگ ہاؤس قائم کرنا اور تمام درس گاہوں میں خصوصیت کے ساتھ حفظانِ صحت، منطق اور ثقافت کے مدرّس اور پروفیسر مقرر کرنا اور طلاب کو اپنے گھروں کے عوض بورڈنگ ہاؤس میں رکھنا ----------- صرف ان بلند سیرت، استوار صحت اور غیر معمولی ذہین افراد کو معلّمی کے عہدے پر فائز کرنا جو تدریس کا فطری ذوق رکھتے ہوں اور ان کے معاشی ومجلسی معیار کو اس قدر وسیع و بلند کرنا کہ وہ آرزوئے ترقی کو اقتدار کی پیدا کردہ گروہ بندیوں کے دام میں گرفتار نہ ہونے دیں۔

ماہرین نفسیات کے بورڈ کی معرفت طلاب کے میلانات معلوم کر لینے کے بعد ان کو اسی نہج کی تعلیم دینا اور صنعتوں میں لگانا۔ طلاب کی جسمانی صحت کی خاطر ورزشوں، تفریحوں اور کھیلوں کا انتظام کرنا اور ان کی ذہنی سلامتی کے واسطے ایسا نصاب ترتیب کرنا جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو نیز طلاب کے پارلیمنٹ بنانا، کلب کھولنا، لکچروں کا انتظام کرنا اور ثقافت کے مبادلے اور بصیرت کی ترقی کے واسطے معلّموں اور متعلّموں کی سیاحت کا بندوبست کرنا، ہر درسگاہ میں تعلیم

بالغاں اور صنعت وحرفت کا انتظام کرنا، رفاہِ عام کے کاموں پر بے اجرت مائل کرنا محنت اور محنت کا احترام کرنے کا ذوق پیدا کرنا۔

اساتذہ اور طلاب کے واسطے مدارج عمر کے مطابق کتب خانے اور مطالعہ گاہیں قائم کرنا اور اساتذہ وطلاب کے لئے علیحدہ شفاخانے تعمیر کرنا اور میڈیکل نگرانی میں ان کی غذا کا بندوبست کرنا۔

۹----------- تحقیقات----------- علمی وفنی ریسرچ کا بورڈ قائم کرنا۔

۱۰-----------بین الاقوامی ثقافت ----------- ادارہ ثقافتِ اقوام (Unesco) وغیرہ سے روابط پیدا کرنا۔

۱۱-----------ترجمۂ فلسفہ و سائنس----------- ایک خاص دارالترجمہ قائم کر کے صرف سائنس اور فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ کرنا۔

۱۲-----------فنونِ لطیفہ ----------- فنونِ لطیفہ اور فلم کو فروغ دینا اور انہیں ایسے سانچے میں ڈھالنا کہ ملک میں پختہ اندیشی اور خوش مذاقی کا جوہر پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلم سے علم افروزی اور سیرت سازی کا کام بھی لینا۔

۱۳-----------اخلاق-----------اخلاق اور اقدار خیر وشر کے مسئلے پر اس نقطہ نظر سے نگاہ ڈالنا کہ یہ چیزیں مطلق وابدی ہیں کہ اضافی و وقتی اور اس تصفیے کے بعد ان کی حکیمانہ تعریف وتعبیر کو سنگ بنیاد بنا کر ان کی تعمیر وتشکیل کرنا۔

۱۴-----------شخصیت-----------لوگوں کو اس بنیادی امر کی دعوت دینا کہ وہ اپنے عادات، ماحول، مزاج اور جذبات سے تھوڑی دیر کے واسطے دست بردار وعاری ہو کر اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی زحمت گوارا کریں کہ ہماری یہ تمام شخصیت اور ہماری شخصیت کے تمام مُسلّمات کی یہ سر بفلک عمارت جس کی چھت کے نیچے ہم آج بڑی فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جسے کرۂ ارض کی تمام عمارتوں کے مقابلے میں ہم سب سے زیادہ پائیدار اور سب سے زیادہ خوبصورت سمجھ رہے ہیں دراصل مکسوبہ ہے کہ موروثی! یعنی اس خوبصورت و پائیدار

عمارت کو ہمارے معمار فکر نے خود تعمیر کیا ہے یا پیدائشی حادثے کی بناء پر ہمیں ترکے میں بنی بنائی مل گئی ہے۔

اور یہ دوسرا خیال صحیح ہو تو سوال قدرتی طور پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اپنی اس حادثۂ پیدائش کی عطا کردہ موروثی عمارت کے عوض کوئی اس سے بمراحل مختلف یا قطعی متضاد عمارت ہمیں بطور وراثت حاصل ہو جاتی ہے تو کیا اپنی موروثی عمارت کے عوض آج ہم اس عمارت کی چھت کے نیچے بافراغت زندگی بسر نہیں کر رہے ہوتے اور کیا ہم اس مختلف یا متضاد عمارت کو اپنی اس موجودہ عمارت سے کہیں زیادہ پائیدار اور کہیں زیادہ خوبصورت سمجھنے پر اپنے کو مجبور نہ پاتے۔

۱۵۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (کیرکٹر) کی تخلیق و تہذیب کی خاطر انسان میں راست اندیشی کا جوہر پیدا کرنا اور ان تمام نفسی امراض کا علاج کرنا جو نفس میں حبس و تنگی پیدا کر کے انسان کو خود کامی کا صید زبوں بناتے اور تاریخ کی اس شہادت کو سننے نہیں دیتے کہ جو شخص انفرادی اغراض کو اجتماعی اغراض پر ترجیح دینے کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ آگے چل کر کبھی خود بھی اکثر و بیشتر تباہ ہو جایا کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کے دوش بدوش اصول پرستی کی شمع کو ہمیشہ روشن رکھنے کی غرض سے آدمی کو نفس کے احترام مقصد (Cause) کی جلالت، عزم کی غیرت، قول کی عظمت اور معاملت کے تقدس سے آشنا کرنا اور انسان کے بھنچے ہوئے سینے کو چوڑا بنا کر اس میں قدرے بے نہایت پہنائی پیدا کرنا کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو اپنے آغوش میں لے کر جذب کر لے اور اس شدت کے ساتھ کہ انا و عالم انسانیت دونوں ایک ایسی وحدت میں تبدیل ہو جائیں کہ ان کے جوڑ کا پتہ ہی نہ چل سکے اور ذات اور کائنات کے تصور میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہ جائے۔

۱۶۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نشر و اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تمام ملک میں اکیڈیمی کی شاخیں قائم کرنا۔ اور ثقافتی معلوماتی فلموں، نمائشوں، لکچروں، تصویروں، تھیٹروں، اخباروں، جریدوں، رسالوں، ریڈیو، رقص، موسیقی اور ادب کی معرفت و دقیق افکار، صحیح گفتار اور کردار کا پیدا کرنا۔

(ب)---------شعبۂ وسعتِ زبان

۱----------فرہنگ ادبیات-----------اپنے نثری وشعری ادب کے تمام مصطلحات، تشبیہات، کنایات اور مرکبات وغیرہ کا یکجا کرنا۔

۲----------فرہنگ ادبیات السنہ دیگر------------اسی قسم کے دیگر ملکی و غیر ملکی ادب پاروں کا مرتب کرنا۔

۳----------فرہنگِ تضادات وتوافقات-------------ایک ایسی فرہنگ کا مدوّن کرنا جو اپنی اور دوسری زبانوں کے متضاد و متوافق الفاظ وتراکیب پر مشتمل ہو۔

۴----------فرہنگ مُہندات-------------دیگر السنہ کے ان تمام الفاظ کا مجموعہ تیار کرنا جنہیں اعراب ومعنی کی تبدیلی کے ساتھ ہماری زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۵----------لغت مُرکبات-----------جدید مُرکبات ادبی بنا کر ان کی تدوین کرنا۔

۶----------سیاسی تجارتی زبان-------------سیاسی (Diplomatic) تجارتی بنکس، کاروباری، دفتری فنی اور علمی زبان و مصطلحات کا پیدا اور وضع کرنا۔

۷----------صحافت-------------صحافت کی درس گاہیں قائم کرنا۔

۸----------خطابت------------خطابت کی تعلیم دینا۔

۹----------دائرہ المعارف کا مرتب کرنا۔

۱۰----------قواعد-----------جدید سائنٹفک گریمر بنانا فارسی عربی کے قواعد سے تجاوز کر کے اپنی زبان کے مطابق بنانا اور عربی کی طرح ابواب قائم کر کے فعل وصفتِ فاعل، مفعول، ظرف وغیرہ کے سانچے بنانا۔ اور مختلف ومختصرات کے اسالیب وضع کرنا۔

۱۱----------تاریخ وتذکرہ-----------علمی، فنی اور ادبی تاریخ نیز اربابِ علم وفن ادب کے تذکرے مُدوّن کرنا۔

۱۲----------رسمُ الخط-----------رسمُ الخط میں اس امر پر غور کرنا کہ ہم صورت حروف میں سے صرف ایک ایک حرف کو منتخب کر لیا جائے تو کیسا رہے گا۔ الفاظ میں جو حروف ملفوظ

نہیں ہوتے انہیں ترک کر دینا اور ایسے اعراب وعلامات کو وضع کرنا کہ انسان وحیوان کے صوتی رشتے سے جس قدر بھی آوازیں اور جس قدر بھی راگ راگنیاں پیدا ہوتی ہیں انہیں ویسا ہی لکھا اور پڑھا جا سکے۔

۱۳-----------تمام علاقائی زبانوں کی ترقی وتوسیع کی خدمت انجام دینا۔

۱۴-----------تحقیقات-----------لسانی ریسرچ کا محکمہ قائم کرنا۔

۱۵-----------لسانی کتب خانہ-----------لسانیات کا ایک وسیع کتب خانہ قائم کرنا اور اس میں صحتِ لہجہ وتلفظ کی بقا کے لئے اہل زبان کے ریکارڈ بھروا کر محفوظ کر لینا۔

۱۶-----------ادارۂ تصنیف وترجمہ----------- علمی دست گاہ اور باہمی رسم وراہ کو ترقی دینے کی غرض سے بالعموم تمام بالخصوص تمام پاکستان کے اعلیٰ سرمایۂ علم وادب کا اپنی اور ایک دوسرے کی زبان میں باہم دیگر ترجمہ اور زندگی کے تمام عملی وفنی مسائل پر کتابیں تصنیف وتالیف کرنا اور اس میں ایک شاخ کھول کر ترجمے کی تعلیم دینا۔

۱۷-----------دارالضربِ الفاظ----------- ان بے شمار کوائف کی خاطر الفاظ کی خاطر، الفاظ کی تخلیق کے لئے جن کا ہماری زبان میں کوئی نام ہی موجود نہیں ہے اور جن میں مثال کے طور پر چند نیچے لکھے جاتے ہیں۔ ایک دارالضرب الفاظ کا قائم کرنا۔

مثلاً

☆ -----------پرندے، چرندے، درندے، حشرات الارض وغیرہ کے ان کے اقسام، ان کی آوازیں، بچے، کھالیں، چالیں، گوشت، بال، رنگ وغیرہ۔

☆ -----------درخت، پودے، پتیاں، شاخیں، شگوفے، کلیاں، پھل، پھول، خوشبو، گوند، چھال، تقاعد، بیلیں، بوٹیاں، بیج، باغ، کنج، سائے وغیرہ۔

☆ ----------- گزرگاہیں، شاہراہیں، آب راہیں، آب گاہیں، سایہ دار راستے، تنگ وکشادہ راہیں، پہاڑوں کے مختلف گوشے وغیرہ۔

☆ -----------الوانِ آواز، جذبات، تاثرات، موسم، مناظر وغیرہ کے مدارج ان کے

چہرے اور مزاج پر تاثرات وتقوش وغیرہ۔

☆ ----------اجسام کے تمام حصے، نشست و برخاست کے تمام پہلو، چشم و ابرو کے تمام اشارات وغیرہ۔

☆ ----------خوشبو، بدبو، محض بو، ماکولات مشروبات کے ذائقوں کے اختلافات۔

۱۸----------انتخاب وتدوین، علمی وادبی کتابوں کا انتخاب اور ان کو طرز نو پر اڈٹ کر کے شائع کرنا۔

۱۹----------نشرواشاعت، جرائد واخبار کی معرفت زبان اور کتب کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

(اگست ۱۹۶۰ء)

O

دیباچہ سیف و سبو

انتقاد و انتخاب تقریباً ناممکن چیز ہے۔اس راہ میں اتنے زبردست پیچ و خم ہیں کہ منزل تو ملتی نہیں، البتہ راہ رو خود گم ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر اس گمشدگی کے عالم میں جہاں کہیں ٹھنڈی چھاؤں ملتی ہے، اسی کو منزل فرض کر کے وہیں ٹھہر جاتا ہے۔

------- انتقاد کی موٹی موٹی تین قسمیں ہیں۔

(۱)۔ تخیلی انتقاد۔(جو آج کل عام ہے)

(۲)۔ تخریبی انتقاد

(۳)۔ تحقیقی انتقاد

اب ان پر باری باری نگاہ ڈالیئے

(۱)۔ تخیلی انتقاد:۔ یہ آج کل کا وہ مروج طرز نقد ہے جس میں ناقد، ادیب و شاعر سے تقریباً بے نیاز ہو کر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے آئینہ میں اپنے خدو خال دیکھتا ہے اور اپنے ہی چہرے کے عکس میں شاعر کے چشم و ابرو کو پیش کرتا ہے۔

اس طرز میں ناقد اپنے ذوقِ ادب کے انتشار، اپنے ذہن کی تخلیقی قوت کے اعلان، اور اپنے نفسیات کے اظہار میں اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتا ہے کہ تحقیقی انتقاد کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

ہر چند اس روش میں ایک انوکھا پن، ایک اپج، ایک ادبی تراش خراش، ایک شاعرانہ آن بان، اور نفسیاتی تحلیل کی دلچسپی و افادیت تو ضرور پائی جاتی ہے لیکن اس میں ادیب و شاعر پنہاں، ناقد پیدا۔ دریا نہاں، سراب عیاں حقیقت کم، اور افسانہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

(۲)۔ تخریبی انتقاد:۔ یہ محض ادبی حاسدوں کا میدان ہے، اور کچھ نہیں اس طرز کو صرف وہی افراد پسند و اختیار کرتے ہیں جو احساس کمتری کی بیماری میں گرفتار ہوتے ہیں اور جنہیں قلق کے ساتھ اس کا احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں قوائے تخلیق سے یکسر محروم رکھا ہے اور جب وہ ارباب تخلیق کی سرفرازیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور وہ اس دھوئیں کی سیاہی سے ارباب تخلیق کا منہ کالا کرنے کی ناکام سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس میدان میں وہ افراد بھی کرتب دکھانے اُترا کرتے ہیں جو زندگی کے کسی موڑ، یا خیالات وعقائد کے تصادم و اختلاف کی بناء پر کسی ادیب یا شاعر سے بگڑ جاتے ہیں اور اظہار غیظ وغضب کا سب سے آسان طریقہ انہیں یہی نظر آتا ہے کہ وہ اس ادیب یا شاعر کا منہ چڑانے لگیں۔ اس کے خلاف محفلوں اور رسالوں میں پروپیگنڈہ کریں، اس کے آرٹ کو توڑ مروڑ کر پیش کریں، ادب کے صحیح مسلمات کو غلط طور سے استعمال کر کے اس میں عیوب نکالیں اور یہ ثابت کریں کہ اس کے ادب وشعر میں نہ تو عمق ہے نہ پاکیزگی، وہ مغرب زدہ ہے (یہ جملے اور الفاظ میں نے اس لئے تحریر کئے ہیں کہ اس قبیل کے حضرات آج کل ان ہی الفاظ میں کھیلتے اور معنی ومفہوم سمجھے بغیر لکھا اور رٹا کرتے ہیں)۔

(۳)۔ تحقیقی انتقاد:۔ یہ راہ متذکرہ بالا دونوں راہوں سے قطعی مختلف بھی ہے اور شدت کے ساتھ صعوبت انگیز بھی سب سے پہلی اور شاید لاعلاج دشواری اس سلسلے میں یہ ہے کہ ------

--------(الف)۔ ناقد، یا تو منقود کو پہلے سے پسند کرتا ہوگا یا پھر ناپسند۔ (جس کے بے شمار نامعلوم اسباب ہو سکتے ہیں۔)

--------(ب)۔ ناقد اگر اس کا ہم عصر وشناسا ہے تو اسے منقود سے محبت وموانست ہوگی، یا نفرت وکدورت یا، کم سے کم، اجتناب ووحشت اور ان دونوں، اور ان کے حمائل تمام دیگر حالات میں بے لاگ انتقاد کا پیدا ہونا امکان سے خارج ہے۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری دشواری بھی، جو پہلی دشواری کی طرح غالباً ناقابل حل ہے،

یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام و کردار، ناقد کے عقائد و روایات کے خلاف واقع ہوتا ہے تو بظاہر انتہا درجے کا بے تعصب ناقد بھی شاعر کے ساتھ انصاف برتنے سے قطعی طور پر قاصر رہ جائے گا۔

ان متذکرہ بالا دونوں قباحتوں کے بعد اب حقیقی انتقاد کی شرطیں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ سب سے پہلی اور سب سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ ----------

ناقد، شاعر کی روح کو اپنے میں جذب کرلے (اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ناقد فطرۃً شاعر کا ہم خیال، ہم رنگ، اور ہم مذاق نہ ہو) اور ظاہر ہے کہ یہ صورت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب ناقد.........

(الف)۔ شاعر کے ماضی و حال اور مستقبل کے میلان، شاعر کے کلیات و نظریات عقائد و اصول، اقارب و احباب، تعلیم و تربیت، محاسن و معائب، مزاج و ماحول موروثی خصوصیات اور جغرافیائی اثرات سے کما حقہ واقفیت پیدا کرلے اور یہاں تک کہ خلوت و جلوت کی مسلسل و بے محابا ہم نشینی کی معرفت شاعر کے مرغوبات و معمولات تک پر کامل طور پر حاوی ہو جائے۔

(ب) شاعر کے زمانے کی خصوصیتوں، تقاضوں اور ادبی معاشری اور سیاسی تحریکوں کو بخوبی ذہن نشین کرلے۔

(ج) ________ تقریباً ان تمام تخلیقی و عملی راستوں سے خود بھی گزرے، جن سے شاعر گزر رہا ہے۔

(د)۔ اور ہر نظم کے باب میں اسے براہ راست، یا کم سے کم، معتبر ترین وساطت سے یہ معلوم ہو کہ اس کا پس منظر کیا تھا۔ اور وہ جذبے کے تموج میں کہی گئی تھی یا تمکین میں۔

ان شرطوں میں سے اگر ایک شرط بھی رہ جائے گی، ناقد حق انتقاد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔ اور اس کا تمام تحریری عمل، ناقص، ناتمام، پیچیدہ، غلط مبہم اور گمراہ کن ہو کر رہ جائے گا۔

یہاں تک تو ذکر تھا انتقاد کا، اب انتخاب کی طرف آیئے۔

سو یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے اس راہ میں بھی ایسے ایسے ہفت خواں ہیں، جن کا طے کرنا معمولی دل گردے کا کام نہیں ہے۔

انتقاد کے باب میں جن دشواریوں اور شرطوں کا ابھی ذکر ہوا ہے تقریباً ان سب کو انتخاب میں بھی شامل کرنے کے بعد انتخاب کی مخصوص دشواریاں ملاحظہ فرمائیں فرض کیجئے کہ انتخاب کے وقت.........

(۱)۔انتخاب کرنے والے کا موڈ خراب، یا مزاج ناساز ہے۔

(۲)۔اس پر کوئی خاص جذبہ طاری ہے۔

(۳)۔رات یا دوپہر کی غذا یا موسم کی شدت ذہن پر برا اثر ڈال رہی ہے۔

(۴)۔یا دفعتاً کسی کرخت غمگین یا میٹھی آواز نے اس کے نظامِ اعصاب و عملِ ذہن میں یکایک اختلال پیدا کر دیا ہے۔ تو ان تمام حالتوں، اور ان کے مماثل تمام دیگر حالات میں صحیح انتخاب ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔

اب دوسروں سے روگردانی کر کے اس پر غور فرمایئے کہ خود شاعر اپنے کلام کا انتخاب کر رہا ہے سو یہ بھی کوئی کھیل نہیں ہے ہر چند بظاہر یہ بہت آسان بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سلسلے میں بھی تقریباً وہ دشواریاں اور پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسروں کے مقابلے میں ہر شخص، اور بالخصوص ہر شاعر اپنی ذات و شاعری سے اس قدر واقف ہوتا ہے کہ دوسروں کے واسطے اتنی معرفت ممکن نہیں ہے لیکن انسان اتنا حیرت ناک اور پیچیدہ حیوان ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طباع و فطین کیوں نہ ہو ثباتِ عقل و فکر کی موجودگی میں، یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے اسے اپنی ذات کی معرفتِ تام حاصل ہو چکی ہے۔

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے!
بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں!

اور یہ غلط اندازے دو وجوہ کی بنا پر قطعی فطری چیز ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ شدید ترین حبِ ذات کی بنا پر ہم اپنے ہر نقص و عیب پر خوشنما پردے ڈال کر خود اپنے کو فریب دیا کرتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے چونکہ انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے یہ انتہائی

قرب ہمارے واسطے اس بات کو بے حد دشوار بنا دیتا ہے کہ ہم اپنے کو اچھی طرح دیکھ اور پرکھ سکیں۔

ہے سب سے بڑا فاصلہ قُرب کا ل
اپنی خلوت سرا میں جاؤں کیونکر

سو اس صورت میں یہ بہت ممکن ہے کہ......

(۱)۔شاعر نے اپنی ذات وشاعر کے متعلق جو رائے قائم کی ہو وہ قطعی غلط، یا صحیح کم، اور غلط زیادہ ہو۔

(۲)۔نیز انتخاب کے وقت اس کا موڈ خراب، یا مزاج ناساز گار ہو۔

(۳)۔اس وقت اس پر کوئی خاص جذبہ شدت کے ساتھ طاری ہو۔

(۴)۔رات یا دوپہر کی غذا، یا موسم کی شدت ذہن پر بُرا اثر ڈال رہی ہو۔

(۵)۔ان شخصیتوں میں سے بعض یا اکثر سے اس کے دل میں فرق آ گیا ہو۔جن سے اس کی بعض نظمیں وابستہ ہیں۔

(۶)۔دفعتاً کوئی کرخت، غمگین یا سُریلی آواز نے نظامِ اعصاب وعملِ انتخاب میں اختلال پیدا کر دیا ہو۔

(۷)۔اچانک طور سے کوئی ایسی موروثی خصلت، یا ایسی ماحولی کیفیت قوت کیساتھ ابھر آئی ہو۔جو بعض نظموں کو اعلیٰ اور بعض کو ادنیٰ قرار دیتی ہے۔

(۸)۔اور وہ ماضی کے بعض عقائد ونظریات اور معمولات و مرغوبات کو ترک اور بعض دوستوں اور عزیزوں سے مایوس، اور بعض محبوبوں سے دل برداشتہ ہو چکا ہو۔اور اس میں بعض نئے خیالات پختہ ہو چکے اور بعض پختہ ہو رہے ہوں۔بعض قدیم اعداد وخیالات فنا ہو چکے ہوں، اور بعض فنا ہو رہے ہوں۔

تو ان تمام حالتوں اور ان کے مماثل تمام دیگر حالات میں خود شاعر بھی اپنا صحیح ترین انتخاب کرنے سے قاصر رہ جائے گا، اور ان تمام نظموں کو نظر انداز کر دے گا، خواہ شاعرانہ حیثیت سے وہ

کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہوں جو اس کے موجودہ نقطۂ نظر اور اس کی وقتی کیفیت سے اب کوئی تعلق نہیں رکھتی ہیں۔

بہر حال اس میدان کا اور چھور اور اس دریا کی تھاہ نہیں مل سکتی ہے اور مجبور ہو کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی انتخاب و انتقاد تقریباً امکان سے خارج ہے اور جب خود ادیب و شاعر، اس سے بہ احسن الوجوہ عہدہ برآہ نہیں ہو سکتا تو بے چارے ناقد سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کے باوصف اپنے ناشر کے پاس خاطر سے میں اس کام کو انجام دے رہا ہوں، کیونکہ ہر نامراد مصنف اپنے بامراد ناشر کے پاسِ خاطر پر مجبور ہوا کرتا ہے۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

''خطا نمودہ ام'' کی حد تک تو یہ مصرعہ یہاں بجا طور سے چسپاں ہو رہا ہے، لیکن ''چشم آفریں دارم'' کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اب تک میری جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تقریباً ان سب کا انتخاب اس میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا نہایت سختی کے ساتھ اہتمام کیا گیا ہے۔ کہ انتخاب نہایت ہی مختصر رہے۔ ظاہر ہے کہ اس انتہائی اختصار کی بناء پر سیکڑوں ایسی نظموں کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے جو اس مجموعے کی نظموں کے بالکل مساوی اور ہم مرتبہ و ہم وزن ہیں۔

اختصار کے باعث ہر قدم پر یہ مشکل پیش آئی ہے کہ دو مساوی حیثیت کی نظموں میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔ اور ہر مرتبہ آنکھیں بند کر کے، بلا وجہ معقول، ایک کو اختیار اور ایک کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کتاب کا حجم چھ، ساڑھے چھ سو صفحے کا ہو جاتا، اور کاغذ کی نایابی و گرانی کے زمانے میں اتنی ضخیم کتاب کی طباعت میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس انتخاب محل کے نو پھاٹک ہیں۔ ان میں سے، انتخاب کی خاطر، میں نے ہر پھاٹک کو کھٹ کھٹایا بعض پھاٹک جلد کھل گئے، بعض کے کھلنے میں دیر، اور بعض میں بہت دیر لگی۔ اور بعض کے کھولنے میں تو لوہے لگ گئے۔ اور دو پھاٹکوں نے تو یہاں تک ستایا کہ سیڑھی لگا کر کودنا اور انہیں اندر سے کھولنا پڑا۔

اور جب ایک ایک کر کے تمام پھاٹک کھول لئے تو دبے پاؤں ان کے احاطے میں داخل ہوا۔ خشک پتیاں میرے قدموں کے نیچے کراہنے اور شاخوں کے درمیان تنے ہوئے جالے میری پیشانی سے مس ہو ہو کر بجنے اور ٹوٹنے لگے۔ آگے بڑھا تو گزرے ہوئے ماہ و سال ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ بیتی ہوئی گھڑیوں نے اپنے چہروں سے آہستہ آہستہ نقابیں اُٹھائیں اور بھولی بسری وارداتوں، اور کہی سنی ہوئی کہانیوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔

اوہ ماضی کی سیر، روح فرسا و زہرہ گداز ماضی کی سیر، میں دوبارہ ان روشوں سے گزرا، اُن کنجوں میں گنگنایا، اُن چشموں کے سامنے رویا، اُن لچکتی شاخوں کی چھاؤں میں سر جھکا کر کھڑا ہوا، اُن ساحلوں پر ٹہلا، اُن موڑوں پر ٹھٹکا، اُن ریگستانوں میں دوڑا، اُن رنگین پہاڑیوں پر چڑھا، اُن خلوت کدوں میں نمناک آنکھوں، اور خشک ہونٹوں کے ساتھ داخل ہوا، اور اُن کی پگھلی ہوئی شمعوں کو حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھا جہاں یادش بخیر میری نوعمری کھیلا کرتی تھی۔ جہاں میری مَسیں بھیگی تھی جہاں طلوع و غروب کی رنگینیوں میں پہلے پہل مجھ پر الہام کے موتی، اور لب و رخسار کے پھول برسے تھے۔ اور جہاں میری نوجوانی، انگاروں سے دہکتی اور پنکھڑیوں سے مہکی ہوئی نوجوانی جھوما کرتی تھی۔

میں نے اس انتخاب کی خاطر دوبارہ اُن شبستانوں کو روشن، اُن باغوں کو شاداب، اُن آسمانوں کو پر سحاب، اُن زمینوں کو سرسبز، اُن دریاؤں کو رواں، اُن امنگوں کو رقصاں، اُن تاروں کو لرزیدہ، اُن رشتوں کو پیچیدہ، اُن جلووں کو غلطاں، اور اُن رخساروں کو فروزاں کیا جو میری نوجوانی کی محبوب ترین متاع اور میری نوعمری کے تاج کے دمکتے ہوئے ہیرے تھے۔ ایسے ہیرے جن کے ہر گوشے پر صدہا کوہ نور قربان کئے جا سکتے ہیں۔

میں نے پھر ایک بار اُن سہانی صبحوں کو ذہن کے افق پر طالع کیا جو میرے شباب کے شبنم آلود سبزہ زاروں پر مسکرایا کرتی تھیں۔ میں نے پھر ایک بار اُن سلونی شاموں کو آواز دی جو سرخ لبوں اور سیاہ زلفوں کے سائے میں تارے چمکایا کرتی تھیں۔ میں نے دوبارہ ان دوستوں کو ذہن میں حاضر کیا۔ جن کے قہقہوں سے میرے چہرے پر سرخی دوڑ جایا کرتی تھی۔ اُن میں سے جو زندہ

ہیں، ماہ و سال کی پرچھائیاں اُن کے چہروں کی شادابی کو ڈھانک چکی ہیں اور جو اس کہنہ سرا میں اب موجود نہیں ہیں، ان کی پیشانیاں میرے آنسوؤں کے اندر جھلکا کرتی ہیں۔

غرض کے اس انتخاب کے چلنوں میں، میں نے ایک ایک کر کے ان تمام دہکتے ہوئے ولولوں کو اپنے دھکتے ہوئے دل میں برانگیختہ کیا۔ جو کبھی میرے وجود پر آتش فشانی کیا کرتے تھے۔ اور اپنے دل کو دوبارہ اُن جمالوں اور خیالوں، نیز اُن راتوں اور وارداتوں سے ڈسوایا جن کا زہر کبھی میرے رگ و پے میں دوڑتا پھرتا تھا۔

عمر کی اس خنک و سنجیدہ منزل میں ماضی کے بھڑکتے جذبات کو جگانا، اور دور پیشیں کے پھنکارتے ہوئے ولولوں سے اپنے کو دوبارہ ڈسوانا، ایک ایسا زبردست سانحہ ہے جس کی نظیر شہداء کے مجاہدانہ کارناموں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔

نکلی لبِ گل سے آہ، خوشبو بن کر
آئی سر میں رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں اُن کی تصویر لئے
تصویر ٹپکنے لگی آنسو بن کر

(سیف و سبو، مطبوعہ مکتبۂ اُردو، لاہور اشاعت اول ۱۹۴۷ء)

O

کچھ اپنے بارے میں

میرے بنانے والے نے مجھ کو شاعری کا ذوق بخشا، اور آزاد خیالی کا جوہر عطا کیا۔ میرے عناصرِ ترکیبی میں یہ صلاحیت ہی نہیں رکھی گئی ہے کہ میں چوگوشیا ٹوپی پہن کر مولوی ابوالحسنات گنگوہی بن سکوں، اور اُن لوگوں میں آجاؤں جن کو "مردانِ صالح" کہا جاتا ہے۔

میرے واسطے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں اُن دنیا پرست دین دار علماء کی تقلید کروں، جن کے متعلق آج سے چھ سو برس پیشتر حافظ شیراز فرما گئے ہیں کہ:

واعظاں، کائیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند، آں کار دیگر می کنند

میں ان فقہائے کرام کی دست بوسی بھی نہیں کرسکتا، جو ظالم و جابر سلاطین کی پابوسی کر چکے اور فتوے فروخت کرتے رہتے ہیں۔

میں اس کھوکھلے دین سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو فقط سماعی ہوتا ہے۔ اور باپ کی میراث کے طور پر بیٹے کو ملتا ہے۔ اور میں اپنے اس خیال کی تائید میں خود قرآنِ حکیم کو پیش کرتا ہوں جو تقلیدِ بے دیدہ موروثی ایمان کو گمراہی قرار دیتا ہے۔

یہ تھا میرے دین کا منفی پہلو، اب مثبت پہلو بھی دیکھ لیجئے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایک عظیم توانائی اس کارخانہ کائنات کو چلا رہی ہے، اور میرے نزدیک جو اس توانائی کی جستجو نہیں کرتا اور اس کے قریب نہیں آنا چاہتا وہ خود اپنی سرکار وجود کا نمک حرام ہے۔

میرے نزدیک تحقیق کی طرف مائل کرنے اور مسائل کے سلجھاؤ پر اکسانے والا تشکک باب اسرار کی وحید کلید ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اندھی تقلید ہے۔

انفس و آفاق کا معنی خیز مطالعہ، خیر و شر کی تحلیل، اسرار کائنات کی جویائی اور علتِ موجودات کی تحقیق ہی اس دنیا کی سب سے بڑی عبادت اور اس کارگاہ بود و ہست کا سب سے بڑا جہاد ہے۔

بُت جو پہلے آستینوں میں تھے، اب سینوں میں اتر چکے ہیں اور لوگوں نے اپنے ہوائے نفس کے پیدکردہ تصورات کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے اور جب میں اس صورت حالات کے خلاف یہ آواز بلند کرتا ہوں کہ:

آیات صفات کی تلاوت نہ کرو
جوئندگیٔ ذات میں غفلت نہ کرو
لفظِ اللہ پردہ ہے، جلوہ نہیں
اس حرفِ غلافی پہ قناعت نہ کرو

تو سوئی عقل والوں کو میرے اس باریک کتاؤ پر غصہ آ جاتا ہے اور وہ میرے خلاف نعرے بازی کرنے لگتے ہیں سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ عامۃ الناس کے دماغ، شدید کاہلی کی بناء پر تفکر و تدبر کے شدائد برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اور یہ لے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ یار لوگ ان نہایت باریک مسائل پاروں کو بھی مٹھی سے اٹھانا چاہتے ہیں جو چٹکی سے بھی نہیں، صرف ناخنوں سے اٹھائے جا سکتے ہیں۔

ان بھولے بھالے خالص منقولی آدمیوں نے ایک زبردست عارف کا یہ شعر شاید کبھی سنا ہی نہیں ہے، جس میں وہ التجا کرتا ہے کہ۔

بیفگن پردہ ، تا معلوم گردد
کہ یاراں ، دیگرے رامی پرستند

کے معلوم کہ میں نامرادِ جستجوئے حق کی بھٹی میں اپنی کتنی راتیں، اپنے کتنے پہر اور اپنی فرصت کے کس قدر بے شمار لمحے جلا جلا کر، ٹھنڈی راکھ میں تبدیل کر چکا ہوں۔

کاندھے پہ لئے ، خاطرِ مجروح کی لاش
ہر گام، اِک زخم تازہ ، ہر سانس، خراش
راہِ منطق میں کھو چکا ہے جس کو
اب تک ہے غلام کو اس آقا کی تلاش

بے شک میں اس روئے زمین کے تمام اکابرِ علم و اقطابِ فکر کی دل سے عزت کرتا ہوں اور ہر چند کہ سقراط، ارسطو، فرانس بیکن، اسپی نوزا، والٹیئر، ہیوم شوپنہار، کانٹ، برگساں، نطشے، اور برٹرنڈ رسل، کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں۔ لیکن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بات ہی کچھ اور ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ تمام انبیائے عالم میں محمدؐ عربی ہی وہ انسانِ اعظم ہیں کہ ازل سے گردش کرنے والا یہ آفتاب آج کے دن تک ان سے بہتر انسان پر طالع نہیں ہوا ہے۔

الٰہی گدا ہوں مجھے شاہ کردے
ضمیرِ محمدؐ سے آگاہ کردے

آپ نے میرے دین کا ذکر سن لیا۔ اب میری شاعری پر نگاہ کیجیے۔

شعر کی دیوی، بیچارے انسان کو فریب دے کے اس قدر زبردست مغالطے اور اس درجہ سر بفلک تعلّی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اللہ دے، اور بندہ لے۔

یہ کم بخت شاعری ہر موزوں طبع و تخلّص دار صاحبزادے کے کان میں بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ افسوں پھونک دیا کرتی ہے کہ برخوردار، اللہ تم کو نظرِ بد سے بچائے۔ تم نام خدا! محرابِ آسمان کے نیچے اور فرشِ زمین کے اُوپر ایک ایسے بے نظیر اور وحدہٗ لاشریک، شاعرِ اعظم ہو کہ آدم سے لے کر تا ایں دم، ماضی و حال کا کوئی ایک شاعر بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہی نہیں بلکہ مستقبل میں

بھی، تمہارے مرتبے کا شاعر قیامت تک پیدا نہیں ہوگا۔

صاحبو! شرماؤں کس لئے اور جھوٹ کیوں بولوں۔ جب نو برس کی عمر میں شاعری کی دیوی نے میرے کان میں بھی یہ افسوں پھونک دیا تھا کہ اے شبیر حسن خان ملیح آبادی خدا کی قسم مشرق سے لے کر مغرب تک کوئی ایک شاعر بھی ایسا مضبوط نہیں ہے کہ میاں، تم سے ٹکر لے سکے ____ لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل نسبتاً صحت مند و سلیم ہے۔ اس نے لڑکپن میں بھی آہستگی کے ساتھ مجھے یہ سمجھایا تھا اور آج بھی بڑی حکیمانہ سنجیدگی کے ساتھ مجھ کو یہ سمجھا رہی ہے کہ دیکھئے صاحب ہوش میں رہیے اپنی شاعرانہ شخصیت کے گرد بھی زریں ہالہ بنانے کا ارتکاب نہ فرمایئے میں اس بات کو مانتا ہوں کہ آگے چل کر اس بات کا امکان ہے کہ آپ کو شاعر بلکہ عظیم تسلیم کر لیا جائے لیکن کان کھول کر یہ بھی سن لیجیے کہ اس طرح پچاس فیصدی اس بات کا امکان بھی ہے کہ مستقبل کا مورخِ ادب، آپ کے بارے میں یہ حکم لگا دے کہ "نام خدا" آپ، سرے سے شاعر ہی نہیں جوش صاحب قبلہ اپنی شہرت کی ہوا میں نہ اُڑیے۔ سرکار ہند کے عطا کردہ خطاب پر نہ اکڑیے، احباب کے نعرہ ہائے تحسین سُن کر مونچھوں پر تاؤ نہ دیجیے، عصر حاضر نابالغ ہے۔ اس کی داد قابلِ اعتبار نہیں، آپ کے سامنے ذوق اور غالب کی زندگیاں ہیں۔ ذوق استاد شاہ تھے۔ دربار نے ان کو خاقانی ہند" کا خطاب بھی دیا تھا اور ان کی شاعری کے پورے ہندوستان میں ڈنکے بجے ہوئے تھے۔

ان کے سامنے غالب بے چارے ایسے تھے جیسے دوپہر کے آفتاب کے روبرو ریوڑی والے کا ٹمٹماتا ہوا دیا۔ ان کے منہ پر انہیں مہمل گو کہا جاتا تھا اور بھری محفل میں ان کی جانب اشارہ کر کے یہ ارشاد فرمایا گیا تھا کہ۔

زبانِ میر سمجھے ، اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور ان آئے دن کے طنز ہائے جگر خراش سے تنگ آ کر مرزا غالب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ جب ذوقؔ و غالبؔ کا مقدمہ عصر حاضر کی ادبی عدالت العالیہ میں پیش ہوا تو تمام ججوں نے متفق رائے ہو کر یہ فیصلہ سنا دیا کہ ذوقؔ تک بند تھا اور غالبؔ شاعر اعظم۔ سو جوشؔ صاحب اس واقعہ سے عبرت حاصل کیجئے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ خانصاحب ایک گوشے میں ڈبکے بیٹھے رہے۔ اور اپنے درجۂ شاعری کے معتین فرمانے میں عجلت سے کام نہ لیجیے کون کہہ سکتا ہے کہ سو دو سو برس کے بعد جب شاعری کی سطح بمراحل بلند ہو جائے گی اس وقت آپ کو غالبؔ کے تخت پر بٹھا دیا جائے گا یا شیخ ابراہیم ذوقؔ کے غار میں دھکیل دیا جائے گا۔

میں اپنی عقل کے ارشاداتِ گرامی کے آستانے پر بصد عقیدت سر جھکاتا ہوں اور اس امر کو بہمہ لیجہ وجوہ دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ عقل کا ارشاد باون تولے اور پاؤ رتی ہے لیکن دیانت ذہنی اور راست گفتاری جن کے ہاتھوں میں ہمیشہ تباہ رہا اور بحمد اللہ کہ آج بھی ہوں، مجھے یہ حکم دے رہی ہے کہ میں اس سلسلے میں لگے ہاتھوں اپنے دل کا چور بھی بیان کردوں اور وہ چور یہ ہے کہ جس وقت بشری کمزوری کی بناء پر میری عقل سلیم رہینِ خواب اور میرا طفلانہ جذبۂ انا بیدار ہوتا ہے اس وقت شعر کی دیوی میرے اس لمحۂ بیمار سے فائدہ اٹھانے کی خاطر لبوں پر مستی کی دھڑی جمائے سُرخ شلوکا پہنے، اور ماتھے پر قشقہ لگائے گزرے سے چھڑے کو بجاتی بڑے ٹھسّے کے ساتھ میرے پاس آئی اور میری پیشانی پر چٹاخ سے بوسہ دے کر مجھے کہتی ہے ظالم تم اس مردار غیبانی عقل کے دھوکے میں آکر اور اس بڑھیا کی روز مرہ سیٹھی باتیں سُن کر خود اپنی نگاہوں سے گر چکے ہو اس کلموئی عقل کو تو وجدان کی ہوا تک نہیں لگی ہے ادھر آؤ لو یہ سونے کا پٹکا ہے اسے کمر میں باندھ لو یہ شاعرانہ عظمت کا زریں خلعت ہے اسے پہن لو اور یہ حیات جاویداں کا جڑاؤ تاج ہے۔ اسے اپنی پیشانی پر کج کرلو یہ سنتے ہی میں خوشی سے باون گز کا ہو جاتا ہوں۔ اور جب میرا بڑھاپا لونڈوں کی طرح شاعری کی ہدایات پر عمل کر کے اچھا خاصا دولہا میاں بن جاتا ہے اور وہ دولہا میاں جب زور زور سے اپنی تعریف میں الاپنے لگتے ہیں تو اس غوغائے عقل کی آنکھ کھل جاتی ہے اور مجھ کو تلخی

گھوڑی بنا دیکھ کر اس کے ماتھے پر کروڑوں شکنیں پڑ جاتی ہیں، وہ لپک کر میرے منھ پر اس زور سے طمانچہ مارتی ہے کہ میرا تاج گر پڑتا ہے اس کے بعد وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے ستر بہتر سال کے بوڑھے، تیرے دودھ کے دانت آخر کب گریں گے؟ دھتکار دے اس بڑبولی شیخی خوری شغل شاعری کو اور جھک جا میرے قدموں پر۔

میں اسی وقت بہت زور سے ایک زبردست شوں کی آواز آتی ہے اور میں باون گزا دفعتاً ایک حقیر ترین بالشتیا بن کر رہ جاتا ہوں۔

تو حضورِ والا یہ صورتِ حال ہے میرے مقامِ شاعری کی۔

(۱۸، جون ۱۹۷۰ء)

○

تنگنائے غزل

نارمل حالات میں نفسِ انسانی پر وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے اور چونکہ غزل میں جذبۂ واحد کے عوض متعدد و متضاد جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور چونکہ غزل، جہاں تک کہ مشاق غزل بافوں کا تعلق ہے، وقتِ واحد میں بنائی اور بنی جاتی ہے اس لئے بلا خوفِ ابطال یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل ایک غلط اور غیر فطری چیز کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر نقطہ ہائے نظر کے لحاظ سے بھی یہی بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غزل کو فطری صنفِ کلام نہیں کہا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری میں اکثر و بیشتر آپ بیتی اور گاہ گاہ جگ بیتی کا کوئی عنصر پایا جاتا ہے کہ نہیں۔ اس بات کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں غزل گو کی سیرت و شخصیت اور اس کی غزل کے مضامین کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ اس

کے کرداور اس کے کردار اور اس کے کلام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا تضاد یا بالفاظ دیگر ہمیں یہ جانچنا ہوگا کہ غزل گو خود اپنی ذات سے مخلصانہ برتاؤ کرتا ہے یا نہیں مثال کے طور پر ریاض خیر آبادی کو لے لیجیے۔

ریاض کی شہرت کا مدار ان کے خمریات پر ہے۔ لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ ریاض نے تمام عمر میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہیں چکھا تھا جس کے یہ معنی ہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرا معنی ہو ہی نہیں سکتا کہ ریاض کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ دار نہیں۔ بلکہ ان کی سیرت کے قطعی برعکس واقع ہوا تھا اس لئے انہوں نے خمریات کے باب میں جو کچھ کہا وہ آپ بیتی میں شمار نہیں کیا جا سکتا جس کے یہ معنی ہیں کہ ریاض خود اپنی ذات سے خلوص نہیں برت سکے اور ظاہر ہے کہ وہ کلام جو سراسر اظہار میں غیر مخلصانہ اور حقائق سے دور ہو وہ فطری نہیں ہو سکتا اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ ریاض کے خمریات آپ بیتی نہیں نہ سہی، جگ بیتی تو ضرور سہی اور کوئی شاعر اگر جگ بیتی کہتا ہے تو اس میں کیا اعتراض کی بات ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ فطری شاعر کے کلام میں جگ بیتی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ نمک میں آٹے کے برابر ہو کے رہ جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی بات ہے کہ مشروبات و ماکولات بالعموم اور شراب بالخصوص ایسی چیز ہے جو جگ بیتی کے ذیل میں نہیں آسکتی اسی لئے کہ اگر آپ کسی کو شہد کھاتے دیکھتے ہیں تو مجرد دیکھ لینے کی بنا پر آپ شہد کے ذائقے سے واقف نہیں ہو جاتے شہد کا ذائقہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اسے چکھا ہو۔ اس طرح وہ شخص جو کسی کو شراب پیتے دیکھتا ہے۔ اس دیکھنے سے اس پر شراب کا نشہ نہیں چڑھ سکتا اور جو شخص کسی کو شہد کھاتے یا شراب پیتے دیکھتا ہے وہ اس کی شیرینی، اور اس کے نشے کو اگر شعر میں بیان کرتا ہے تو اس کا شعر حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا اور جو شعر یا جو صنف سخن اس قسم کے غیر حقیقی اشعار کا مجموعہ ہو اُسے حقیقی صنف نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی کی غزلوں کو لے لیجیے۔ منشی صاحب ایک مولوی بلکہ متقی قسم کے بزرگ اور خانوادہ حضرت شاہ ضیاء کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا تقدس و تقشف اس

قدر بلند و مستحکم تھا کہ ان کے باب میں ان کا کوئی بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی ایک بار بھی زنانِ بازاری کا کوٹھا دیکھنا تو بڑی بات ہے، کسی نامحرم عورت یا کسی اَمرد کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو لیکن ان کی غزلیں دیکھئے تو ان کا تمام کلام بازاری عورتوں کے چونچلوں، بداطوار لڑکوں کے لچھنوں، بھنگڑ خانوں کے نعروں اور شاہد پرستی کے غلغلوں سے گونجتا ہوا نظر آتا ہے سر پیٹنے کی بات ہے کہ منشی امیر احمد مینائی اور یہ شعر فرمائیں ۔

حیا بولی اُبھرا ہو جوبن کسی کا
مٹا دوں گی میں چلبلا پن کسی کا
آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اور یہ ریاض خیر آبادی یا امیر احمد مینائی ہی نہیں ہمارے تمام غزل گو یہی اندھیر کرتے رہے ہیں، اور وہ راہِ راست پر نہیں آئے تو ہمیشہ یہی کرتے رہیں گے۔ کتنی غضب کی بات ہے کہ ایک شخص کبھی شراب نہیں پیتا۔ کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوتا لیکن وہ جب غزل لکھنے بیٹھتا ہے تو شرابی اور عشق پیشہ بن جاتا ہے اسی طرح ایک شخص حقیقتاً رند پیشہ اور عشق مشرب ہے، لیکن غزل میں وہ مسائل تصوف و ایمان کے دریا بہاتا نظر آتا ہے، کیا ہم اس قسم کے کلام کو شاعری کا لقب دے سکتے ہیں؟ اب کیا یہ طرزِ کلام نفسِ شاعری اور دنیا کے تمام زبانوں کے شعراء کے منہ پر ایک طمانچے کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے یعنی ہماری غزلوں کے کم سے کم اسی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہمارے تمام غزل گو حضرات ماشاءاللہ عشق پیشہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہر عاشق کی داستانِ عشق دوسرے عاشق کی داستانِ عشق سے مختلف ہوا کرتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شخص کی داستانِ عشق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عاشق کے عشق میں کہاں تک شدت تھی، معشوق کا مزاج کیسا تھا عاشق و معشوق کے ماحول کی نوعیت کیا تھی عشق کی ابتداء کیونکر ہوئی، عشق پروان کیوں چڑھا عشق کامیاب رہا یا ناکام اور اس

کے ساتھ ساتھ اس داستانِ عشق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عاشق و معشوق کس دور اور کس خاندان کے لوگ تھے اور اس دور میں معاشرے کی مخصوص وضع کیا تھی لیکن جب ہم اپنے اساتذہ کی غزلیں پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی داستانِ عشق یکساں تھی۔ تمام عاشق اور تمام معشوق ایک ہی مزاج و ماحول اور ایک ہی خاندان کے افراد تھے ان سب کے عشق کی شدت بھی مساوی تھی۔ ان سب کا دورِ حیات بھی ایک ہی تھا۔ ان سب کے عشق کی ابتداء و انتہا بھی ایک ہی طرز پر ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ ایک ہی دور کے باشندے تھے اور ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت سب کا انتقال ہوا تھا ان میں سے ایک غزل گو کی صورت بھی ایسی نہ تھی کہ معشوق اس پر روتا یا کم سے کم اس کی طرف مائل ہو جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہر غزل گو بدقسمتی سے اس قدر بدصورت ہوا تھا کہ معشوق نے اسے منہ نہیں لگایا اور جب وہ سامنے آیا تو اسے دھتکار دیا۔

دیکھتے ہی مجھے محفل میں انہیں تاب کہاں
خود کھڑے ہوگئے آتے ہوئے باہر باہر

اور اس کے ساتھ ہمیں انہی غزلوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو کے معشوق کا کم سے کم ایک عاشق اور بھی ہوا کرتا تھا اور وہ خدا کے فضل و کرم سے اس قدر حسین و جمیل ہوتا تھا کہ معشوق اس پر جان دیا کرتا تھا اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر غزل گو بزدل اور نحیف و لاغر بھی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ ہمارا ہر غزل گو اس کی شکایت کرتا پایا جاتا ہے کہ رقیب دیو پیکر نے مجھے محفل جاناں سے پیٹ کر نکال دیا۔

الغرض ان تمام حیرت ناک یکرنگیوں اور یکسانیوں کے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان غزل گویوں کے عشق کی لاکھوں داستانیں دراصل کاربن پیپر کی اتاری ہوئی نقلیں ہیں۔ اس داستانِ عشق کو جو سب سے پہلے غزل گو نے قلمبند فرمائی تھی۔ آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

۱..... پہلا غزل گو قنوطی تھا۔ ابتداء سے لے کر آج تک کے تمام غزل گو قنوطی ہیں۔

۲..... پہلا غزل گو بازاری عورتوں اور بداطوار لڑکوں کا عاشق تھا۔ ابتداء سے لے کے آج تک تمام

غزل گو بازاری عورتوں اور بدقماش نوخیزوں کے عاشق رہے۔

۳.... پہلے غزل گو نے مجازی عشق کی شراب میں کوثرِ تصوف کی چند بوندیں ملا دی تھیں۔ ابتداء سے لے کر آج تک کے تمام غزل گو شراب عشق مجازی میں کوثر تصوف کی چند بوندیں ٹپکا رہے ہیں۔

۴.... پہلا غزل گو بقول خود شرابی تھا۔ ابتداء سے لے کر آج تک تمام غزل گو بقول خود شرابی ہیں۔

۵.... پہلے غزل گو پر سیاسی، معاشرتی، بحرانوں اور مناظرِ قدرت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا تھا۔

ابتداء سے لے کر آج تک کے غزل گویوں پر بھی ان چیزوں کا اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ اور آج کل جو چند سیاسی یا مناظری غزلیں نظر آ رہی ہیں دراصل انہیں غزل کا خطاب دیا ہی نہیں جا سکتا۔

۶.... پہلے غزل گو کا معشوق (عورت اور امرد) اکثر جھوٹا، بدزبان، متلون القلب، ہرجائی بدچلن، اور عاشق کش ورقیب نواز تھا۔

ابتداء سے لے کر آج تک کے غزل گویوں کے معشوقوں کے یہی لچھن رہے اور ہیں۔

۷.... پہلا غزل گو بزدل، بدصورت اور نحیف الجثہ تھا اور اس کا رقیب بہادر، خوبصورت اور قوی تھا۔

ابتداء سے لے کر آج تک تمام غزل گو اور ان کے رقیب ویسے ہی چلے آ رہے ہیں۔

۸.... پہلا غزل گو جذبۂ حیا و خودداری سے محروم تھا۔ اور رقیبوں اور دربانوں کے دھکے کھانے اور خود معشوق کے بار بار دھتکارنے کے باوجود بزمِ جاناں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دربان کی خوشامدیں کیا کرتا تھا۔

ابتداء سے لے کر آج تک غزل گو ماشاءاللہ اس قسم کی مشقیں فرما رہے ہیں۔

۹.... اور پہلا غزل گو زاہدوں سے نفرت کرتا، دنیا کو فانی سمجھ کر نا قابلِ اعتناء سمجھتا، اپنے جسم کی لاغری کا رونا روتا، اپنی مفلسی پر آنسو بہاتا، رقیبوں کو کوستا اور ابتداء سے لے کر آج تک کے تمام غزل گو ان تمام معتقدات کا اعادہ فرماتے رہے ہیں۔ اس غیر فطری یکسانی اور اس غیر نفسیاتی ہم

آہنگی پر غور کر کے کوئی اللہ کا بندہ اب تک یہ سمجھنے کی جسارت نہیں کر رہا ہے کہ اس قسم کا کلام شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری کی نقالی ہے اور نقالی بھی شرمناک قسم کی نقالی ہے اس حیرت ناک صورتِ حال کو دیکھ کر اب تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہزاروں لاکھوں آدمی، شخصِ واحد نہیں بن سکتے ہیں۔ اور کوئی ایسا جید ذہن اب تک پیدا نہیں ہوا ہے کہ اس کا مزاج اور اس کی زندگی کے تمام حالات، لاکھوں افراد کی زندگی اور ان کے مزاج کا مکمل آئینہ دار ہو۔ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری اپنے زمانے کی موزوں اور شیریں تاریخ اور شاعری شخصیت کا ایک کھلکتا ہوا افسانہ اور خود نوشت حیات نامہ ہوتی ہے تو اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک زبردست شرمندگی اور ایک عظیم مایوسی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے اور ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی ہے کہ ہم دنیا کی عظیم شاعری اور دنیا کے عظیم شاعروں کے روبرو اپنی غزل کی اوچھی پونجی کو پیش کریں جو خوردہ اندیشی و خوردہ فروشی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔

اگر ہماری غزلوں کو سُن کر دنیا کو کوئی نقادِ جلیل ہم سے یہ پوچھ بیٹھے کہ آخر آپ لوگ اس کلام کی معرفت ہم سے کہنا کیا چاہتے ہیں اور آپ کی غزل انسان کے دماغ میں فکر کا کون سا دریچہ کھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری قومی غیرت اس کا کیا جواب دے گی اور اس کو ہم یہ کیوں کر باور کرا سکیں گے کہ اگر ہمارے غزل گو جوانی سے لے کر بڑھاپے تک ایک ایسے معشوق کا دم بھرتے رہتے ہیں جس کا نام کسی مردم شماری کے رجسٹر میں موجود نہیں ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور ایک مصنوعی قسم کا قلبِ گداختہ بھی ایک بڑا دوست پیدا کر سکتا ہے۔

(۱۹۵۸ء۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے پڑھا گیا)

○

بیٹی سعیدہ خاتون کے نام

۳۰۸۔ایف

اسلام آباد

۳۱۔۱۰۔۷۳

رات کے ایک بجے

سعیدہ بیٹی، ایک طرف تو سجاد کی بے اصول زندگی، اور اس کی صحت کی خرابی ہے دوسری طرف تمہاری ماں کی ناتوانی اور دماغی بیماری ہے، تیسری طرف تمہاری صحت کا تزلزل ہے چوتھی طرف یہ صدمہ جاں کاہ کہ میری آمدنی کم ہے کہ میں اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کی حسب آرزو، مالی مدد نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔۔اور پانچویں طرف یہ غم کہ تمہارے لڑکوں نے تعلیم حاصل نہیں کی، اور ان کو کس مد میں کھپاؤں، اور میرے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔

غور کرو، میری ایک جان ہے، اور اتنے روگ ہیں، میری دانش مندی مجھ کو بہلاتی رہتی ہے، ہنستا بولتا ہوں، لیکن گھن لگا ہوا ہے دل میں۔۔۔۔۔۔ جاگتے سوتے ضربیں لگتی رہتی ہیں مری جان پر۔

رئیس نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا۔ کاش وہ میری لاش پر روتا۔ ہائے میرا بھائی میرا محبوب بھائی مجھ سے بچھڑ گیا۔ اور میں نامراد مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

میری بشاشتوں، میری بُز ور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھاؤ بیٹی میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں، جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

سرسبز ہوں بظاہر، باطن میں خون ہے دل

تمہاری ماں کی عدم موجودگی نے اور بھی اداس کر رکھا ہے۔ در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے۔ میاں کو شادی کے عذاب میں کب مبتلا کر رہی ہو۔ مہینے اور تاریخ سے آگاہ کرو تا کہ اس بہانے کراچی آؤں۔ اور تم کو تمہاری ماں، اور چھوٹے لڑکوں سمیت یہاں لے آؤں۔ تا کہ میرا گھر آباد ہو جائے، اور قلندر اور نجمی، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں یاد رکھو اگر یہ دونوں بچے کراچی میں رہے۔ تو سو فی صد تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ کاش ان میں عقل آئے۔

علی کی نوکری طے ہو چکی تھی۔ تم نے تار بھیج کر بلا لیا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے جانے دیا کہ تم وہاں اکیلی ہو، ذرا راحت ہو جائے گی۔ میں نے تمہاری پریشانی کا خیال کیا۔ اس کے مستقبل کی پرواہ نہیں کی، یہ ہیں محبت کی نادانیاں اور ستم رانیاں۔

بیٹی اپنے بھائی کو بھی آمادہ کرو کہ جب میں تم سب کو یہاں لے آنے کے واسطے کراچی آؤں وہ بھی میرے ساتھ چلا چلے، تا کہ اس کا حسب منشاء علاج کر سکوں، اور جب مر جاؤں تو میرا سارا کنبہ، میرے سرہانے بیٹھا ماتم کر رہا ہو۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

☆☆☆

اب روئے سخن پھیرتا ہوں سجاد کی طرف۔

میرے بیٹے، میرے پاس آ کر رہو، میری تنہائی پر رحم کرو، جب تمہیں یاد کرتا ہوں، دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم، اس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو کہ باپ کی معیت سے جی چراتے ہو، اور کراچی میں پڑے ہوئے خود کو بھی گھلائے ڈال رہے ہو۔۔۔۔۔ خدا کے واسطے میری پکار سنو۔ اور میری آغوش میں آ جاؤ۔

قلندر اور نجمی کراچی تم کو تباہ کر کے رکھ دے گی، بچو! یہاں آ جاؤ میں تمہاری تعلیم کا ایسا بندوبست کر دوں گا کہ تم میں جینے اور جلانے کی طاقت پیدا ہو جائے گی، دیکھو، میری بات نہیں مانی تو آئندہ سر پکڑ کر روؤ گے۔

شہناز، تمہارا خط ملا کل تمہاری ماں کہہ رہی تھیں کہ وہ تم کو پنڈی بلالیں گی میری رائے بھی یہی ہے کہ تم منے کے آنے تک، ماں ہی کی پاس رہو۔۔۔۔۔۔

سعیدہ بیٹی، اپنی ماں کو بڑے پیار سے رکھنا، بیٹی کا سا نہیں ماں کا سا برتاؤ کرنا، ان کی جھڑکیاں سننا، اور مسکرانا۔

ہائے میری اشرف جہاں اللہ تم کو سلامت رکھے، اور بیوگی کے بعد بھی تم آرام و عزت سے رہو۔ میری شاہانہ مزاج کی تند خُو اور، میری چہیتی باوفا بیوی۔ بوئی اور غزلیا سے میری دعا کہو، اور ان کے بلوں کو میری طرف سے پیار کرلو، سجاد کے بچوں تک بھی میری دعا پہنچا دو اور منّی سے کہو، تیرے خط کا جواب دوں گا، انور سے بھی میری دعا کہہ دینا۔ اور ہاں ناصر و نور سے بھی میری بہت بہت دعا کہہ دینا۔

تمہارا بظاہر بشاش اور بباطن افسردہ باپ
جوشؔ

O

اسلام آباد
۲۳-۱-۷۳

کلوا، تم پریشان نہ ہو۔۔۔۔۔ میں اچھا ہوں کچھ معمولی سی شکایتیں ہیں، سو، دور ہو جائیں گی۔ جب سے گئی ہو، ایک خط بھی نہیں لکھا۔

یہاں آج کل موسم نہایت شدید ہے۔ آج کئی روز کے بعد سورج نکلا تھا مجھ کو لڑکی اور لڑکے، دونوں کی طرف سے دکھ ہے جیسی چاہیے، تم دونوں کی ویسی مدد نہیں کر سکتا۔

میری اشرف جہاں کیسی ہیں۔ اللہ انہیں تن درست کردے اور سلامت رکھے۔ قلندر رے، اور کپی کیسے ہیں بوئی کے بچے، بیوی کو ستاتے تو نہیں اچھا بھئی، خدا حافظ۔ شام کا وقت، اور پونے چھ

بج چکے ہیں اب میں اپنی عبادت میں مشغول ہوتا ہوں۔

یہ ضرور لکھو کہ میاں کب آ رہا ہے اور کوئی شادی کی تاریخ ٹھہری ہے کہ نہیں بلّو کا بی بی کو سلام۔

اور اماں آپ کو بھی۔

تمہارے اور اشرف جہاں کے بغیر
اُدھیڑ اُدھیڑ کر جینے والا
جوشؔ

○

نواسے سراج انور کے نام

اسلام آباد

۲۳-۱۲-۲-۷۔ صبح

میرے دُلارے سراج،

خط ملا، خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی، اللہ تم سب کو سلامت رکھے۔ میاں کی چھٹی کے واسطے اُن کے افسرِ اعلیٰ کو یہاں سے فون کرادیا ہے، اور قوی اُمید ہے کہ وہ جلد کراچی آجائے گا تم سب کی یاد میرے دل کو بُرماتی رہتی ہے۔ شام کو تم اور قلندر دونوں مصاحب یاد آتے ہیں ہائے کیسے بچھڑ گئے ہم لوگ۔

بیٹا اپنی بے کس نانی کا بہت خیال رکھو، ان کو شریر بچوں کی ٹھوکروں پر نہ چھوڑو، ہر وقت اُن کی خدمت کرتے رہو، اور بے والی وارث خیال کر کے ان سے منہ نہ موڑو انہوں نے تم سب کو بڑے لاڈ سے پالا ہے۔

اپنی بہنوں، اُن کے بچوں، شاہ ناز اور علی کی دلہن سے میری دعا کہو خدا کرے ناصر و نور بھی خیریت و آرام سے ہوں۔ یہ لوگ تو مجھے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔ چھٹی اور لالو کو میری طرف سے پیار کرو۔

دیکھو بیٹے، پھر تاکید کرتا ہوں کہ بیوی کے دل کو ٹوٹنے نہ دو اور انہیں خوش رکھنے میں ہر آن سرگرم رہو۔ قلندر کو، جوش بن کر کلیجے سے لگالو، اور مُنی میاں کا، آئینے کے سامنے منہ چوم لو۔

بیٹا، ہم تو اب دنیا سے جلد سدھار جانے والے ہیں، ابھی سے اپنے دل کو سخت بنانا شروع کر دو ورنہ میری موت کی خبر سن کر بھقا تا نکل جائے گا۔

تمہارا بڈھوک

جوشؔ

ہلالؔ نقوی کے نام

۱۶/۳ ایف، اسٹریٹ نمبر ۶
اسلام آباد
۸۔۸۔۷۷

میاں ہلالؔ نقوی۔ خوش رہو بیٹے!

تمھارے کئی خطوط ملے کچھ کے جوابات بھی دیے۔ بہت بیمار ہوں زیادہ لکھنے کی طاقت اب باقی نہیں رہی۔ تمھارا تحقیقی مقالہ کس منزل پر ہے؟ میرا استدس ''آگ'' کسی سے مل سکا یا نہیں۔ تم اپنے سوال کے جواب میں میری یہ عبارت اپنے مقالے میں لکھ سکتے ہو۔۔۔۔۔۔

''میں آج تک خود استاد بن نہیں سکا ہوں۔ پھر شاگرد کس کو بناؤں؟ بہر حال میں نے (غالباً سنہ ۱۹۶۹ء میں) ہلالؔ کے ایک مرثیے پر کہیں نہ کہیں اصلاح کی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہلالؔ جو کل ماشاء اللہ بدر کامل بننے والا ہے میرا اولین شاگرد ہے۔ دورانِ اصلاح میں نے ہلالؔ کی فکر پر اپنی فکر کے پہرے بٹھانے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ جہاں بہت ضروری خیال کیا اور زبان میں کوئی نقص دیکھا، اصلاح کی اور فکری رُخ میں کبھی دیوار نہیں بنا۔ یہی میرا طریقہ اصلاح ہے۔ بیٹے۔ تم اب میری موت کی خبر سُننے کے لیے طیار رہو۔ تمھارا قلمی مرثیہ ''کائنات انقلاب'' بھی مل گیا ہے دو ایک روز میں اس پر مضمون لکھ کر بھیج دونگا''۔

--------جوش ملیح آبادی

میاں ہلالؔ، ور خشاں باد

اس وقت، میری ذہانت کا چراغ بجھا ہوا ہے۔ اس لیئے کہ خلاف معمول، بہ تاخیر سے بیدار ہوا ہوں۔

سہرا کہنا تو بڑی بات ہے، مجھ سے تو یہ خط بھی لکھا نہیں جا رہا ہے۔ خط اس طرح لکھ رہا ہوں، جس طرح، کمزور بینائی والا، سوئی کے ناکے میں ڈورا ڈالتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ رسم از دواج، محبت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور شوہر صاحب کا احساس ملکیت زوجہ کے حُسن کو نگل لیتا ہے۔

ابھی تم اور نسرین، طالب و مطلوب ہو کل شوہر و زوجہ میں تبدیل ہو جاؤ گے، اور چند روز کے بعد تم دونوں کا قرب مسلسل ہزاروں میل کا بُعد بن جائے گا۔

جب تک شادی نہ ہو، معشوقہ، محمل نشیں لیلیٰ ہوتی ہے، اور شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہلالؔ میاں، مبارک ہو، کل بدر بن جانے کے بعد تمھاری آب و تاب میں تو ضرور اضافہ ہو جائے گا مگر بانکپن باقی نہیں رہے گا۔

مبارک باد، کرّم وھم، کرّم وھم!

جھنکی جو ہوا جاگ اُٹھے ہنگامے — بجتے ہُوئے لمحوں نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی سرِ بزمِ طرب — بھیجے گئے ہچکیوں کو دعوت نامے

تم دونوں کا خیر خواہ جوشؔ۔ ۲۹۔۶۔۷۸، اسلام آباد

O

میاں ہلال نقوی

خوش و خرم رہو!

تمہارے خطوط کا جواب کیسے دیتا ہاتھ تو کانپتے ہی تھے، اب قوتِ سماعت و بصارت نے بھی کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ چشمہ تو استعمال کرتا ہی تھا اب آلۂ سماعت کا بھی سہارا لینا پڑ گیا ہے، یہ خط خود نہیں لکھ رہا[1] تُف ہے جوش کی مجبوریوں کے اس دور پر، سوچتا ہوں کہ اس کی کن کن "نعمتوں" کا شکر ادا کروں۔

تم نے جمیل مظہری کا شکائتی قطعہ بھیجا تھا[2] "یادوں کی بارات" میں نہ صرف جمیل مظہری بلکہ دوسرے دوستوں کا بھی ذکر تھا مگر نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی، کتاب چھپنے گئی تو اس کے اصل مسودات میں سے بعض تذکرے کوئی لے اڑا۔

لکھنؤ سے تمہارا خط آیا تو وہاں کے گلی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، لیکن جمیل مظہری کے انتقال[3] کی خبر پڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہو گیا۔ ہائے جمیل مظہری؟

---

[1] راقم السطور نے ہندوستان کے مرثیہ نگار عظیم امروہوی کا مرثیہ تبصرے کے لئے جوش صاحب کو اسلام آباد بھیجا تھا لیکن اُن کی علالت جواب دینے سے مانع رہی چنانچہ میرے ایک دوست جو اسلام آباد ہی میں رہتے ہیں جوش صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے جوش صاحب نے لیٹے لیٹے یہ خط لکھوایا۔

[2] پروفیسر محمد رضا کاظمی، جمیل مظہری کے عزیز قریب ہیں انہوں نے مرحوم کا ایک قطعہ مجھے دیا تھا کہ میں جوش صاحب کو ارسال کر دوں اور اس کے متعلق اُن کا جواب حاصل کیا جائے۔ جمیل مظہری کے جس قطعے کو جوش صاحب نے شکایتی قطعہ کہا ہے وہ یہ ہے۔

سلام اے جوش یار ہم زباں کی اتنی ناقدری
سلام اے جوش اپنے مدح خواں کی اتنی ناقدری
بھلایا نام اُس کا اپنی یادوں کی براتوں میں
جمیل مظہری سے قدر داں کی اتنی ناقدری

[3] پی ایچ ڈی کے لئے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں جب میں لکھنؤ میں تھا جمیل مظہری کے انتقال کی خبر ملی میں نے جوش صاحب کو خط لکھتے ہوئے اس خبر کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ (مرتب)

کیا کہوں؟ کیا لکھوں؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا، کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آنسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی کوئی باقی رہا ہو۔

تم نے ہندوستان کے مرثیہ نگار عظیم امروہوی کے مرثیے پر تبصرہ لکھنے کی فرمائش کی ہے، لیکن صحت کی خرابی اب اس قسم کے کام نہیں کرنے دیتی، کل ایک صاحب سے مرثیے کے کچھ بند پڑھوا کر سنے، یہ بات وجہ مسرت ہے کہ ہندوستان کا نوجوان شاعر فکر و نظر سے کام لے رہا ہے اور حسینؑ ابنِ علیؑ کے معرکۂ حق سے درسِ عمل دینے پر آمادہ نظر آتا ہے، لیکن افسوس کہ سننے والوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی، اور شاعر کی ہر کوشش رائیگاں چلی جائے گی۔ اب مرثیے کو روشن دماغ نوجوانوں کی ضرورت ہے ورنہ اس صنف کا وجود ختم ہو جائے گا۔ عظیم امرہوی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک عظیم انسان کے مرثیے کو نئے احساسات کی آب و تاب دے کر لکھا ہے۔

اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کون سا مرثیہ کس سنہ میں لکھا تھا۔ اگر تمھاری اہلیہ میری شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتی ہیں تو شوق سے لکھیں وہ تمھاری رہنمائی میں یہ کام بہتر طور پر کر سکیں گی۔

تم دونوں کا خیرخواہ

جوشؔ ۲۳۔۹۔۸۰

ہلالؔ میاں،

اُردو بورڈ کے حوالے سے نسیم امروہوی صاحب کی خدمات پر میں کیا لکھوں، بورڈ سے میرا تعلق زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکا۔ وہ یقیناً بہت عالم آدمی ہیں۔

لفظ پر نسیم امروہوی کی علمی گرفت کا میں معترف رہا ہوں۔ اتنے محنتی اور مشفقی لوگ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ مجتبیٰ[1] اور شورؔ[2] کو میرا پیار پہنچا دینا۔ نسرین کو دُعا

تمھارا جوشؔ

۱۴۔۸۔۷۸

اسلام آباد قبل طلوع

O

پیارے ہلالؔ

تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے یہ معاملات، میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں۔ تم نے جس سوال کا جواب چاہا ہے وہ بہت تفصیل چاہتا ہے، اور کمزوری ہے کہ بدن توڑے دے رہی ہے، زیادہ لکھتا ہوں تو حروف کی شکلیں مسخ ہونے لگتی ہیں۔

میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے "مسدسوں" کو مرثیہ کہا جائے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں ہے کہ انھیں آپ مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیشِ نظر اس قسم کے مسدس لکھتے وقت مرثیے ہی کا تصور رہتا ہے میرا موضوع ان مرثیوں میں جب کربلا، حُسینیت، عزمِ شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر "نقادوں" کی یہ رٹ کہ جوشؔ کے مُسدّس جدید مرثیے نہیں ہیں میری سمجھ میں نہیں آتی ۔۔۔۔۔۔۔ اب اس سے زیادہ لکھنے کی ہمت باقی نہیں۔

تمھارا پیار جوشؔ

۱۷۔۶۔۱۹۸۱ اسلام آباد

---

[1] پروفیسر مجتبیٰ حسین [2] پروفیسر منظور حسین شور (مرتب)

ڈاکٹر رالف رسل کے نام

انگلستان کے رسولِ اردو، حضرت رسل کو سلام پہنچے، ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے لندن آ رہا ہوں۔ آپ سے مل کر شاد کام ہوں گا۔ اور اپنے کلام کے ترجمے کے باب میں گفتگو بھی کروں گا۔

اُتار کا وقت ہے۔ ہاتھ کانپ رہا ہے، زیادہ لکھ نہیں سکتا۔

نیاز مند، جوشؔ
۲۱۔۳۔۱۹۷۶ء کراچی

(۳۵۱) ایف۔۳/۶۔ا سٹریٹ (۶) ایمبیسی روڈ، اسلام آباد۔ پاکستان

(بشکریہ جناب مظفر عباس فرزندِ منور عباس ایڈوکیٹ مرحوم، کراچی)

علامہ جمیل مظہری کے نام

آج کل کے دفتر سے

۲۷-۳-۱۹۵۱

سنئے مظہری صاحب، میرے خون میں آفریدی پٹھان ہے۔ اس کا تو یہ فرمان ہے کہ بائی (بھائی) اس آدمی (مظہری) کے خط کا جواب ہرگز نہ دے۔ یہ تیرے خطوط کا جواب نہیں دیتا۔ بہوت خراب آدمی ہے یہ دبلا والا "بد" خبردار خان صاحب "بد" کے بعد "معاش ہرگز نہ کہنا" "اچا بھائی" لیکن بڑی مشکل تو یہ ہے کہ طبعاً میں سید واقع ہوا ہوں اور میرے قلب سیادت میں آپ کا وہ ہے جسے فاسقوں، شعراؤ صوفیاء کی زبان میں "عشق" کہا جاتا ہے اور چونکہ ہر سالا عشق پرلے درجے کا بے حیاو بے غیرت بلکہ "لوشب وصل غیر بھی کاٹی" قسم کا نفرا ہوتا ہے اس لئے۔

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کا ارتکاب کرتا رہتا ہوں اور اسی بناء پر میرے خطوں کے جوابات ہضم کرنے والے علامہ صاحب آپ کا یہ نسلاً پٹھان اور طبعاً سید عاشق آپ کے خط کا جواب دے، اور "شب وصل غیر" کاٹ رہا ہے۔ آخ تھو، عاشق سالے پر۔

۱؎ جوشؔ صاحب کے اس خط کی فوٹو اسٹیٹ نقل، محمد رضا کاظمی صاحب کے پاس تھی جو ان کے کاغذات میں کہیں گم ہوگئی۔ علامہ جمیل مظہری کے بھانجے جناب ثاقبؔ مظفر پوری سے مجھے کائنات (ہدایت گڑھ) کا جمیل مظہری نمبر (۱۹۸۲ء) ملا جس میں یہ خط انتہائی ناقص کتابت کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

جی ہاں بلایا تو گیا ہوں پٹنے، لیکن معلوم ہوتا ہے۔

ایں قیمتِ گراں کہ بود گوہر مرا
ترسم کہ رنگِ روئے خریدار بشکند

والا معاملہ درپیش ہے اور مشاعرے کے داعی صاحب حبسِ دم کی مشق فرما رہے ہیں میں اپنے اصول کو نہیں توڑنے کا۔ اگر مشاعرے والوں نے میرے شرائط بے کم وکاست منظور کر لیے تو آؤں گا۔ ورنہ آپ اور میاں صاحب[1] کے دیدار کی تمنا کو کلکتے کے مشاعرہ تک قابو میں رکھوں گا۔ اور کلکتے سے دہلی جاتے ہوئے دو ایک دن کے واسطے پٹنے میں قیام کر دوں گا۔ مہینے اور تاریخ مشاعرۂ کلکتہ سے بعد کو آگاہ کر دوں گا۔

اور ہاں، ابھی لکھنؤ میں یہ خبرِ بد، پٹنے کے ایک مولانا کی زبان نے سنائی کہ میاں نے داڑھی رکھ لی۔ میاں اور داڑھی، ایں چہ بوالعجبی! خدارا اس خبر کی تصدیق نہ کیجیے گا۔ مجھے اس خیال میں رہنے دیجیے کہ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔ غلط ہی ہوگی، یہ بدقولی جلیبی خبر۔ میاں کی سیادت وغیرت اور ان کا جمالیاتی شعور بھلا یہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وہ ——————————————

آپ کے خط سے انتشارِ خط کا پتہ چلتا ہے۔ یہ روش سراسر غلط ہے ہم مردانِ خدا پر انتشار تو طاری
ہو سکتا ہے مگر قابض نہیں ہو سکتا اس لیے کہ۔

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بے شک ہم پر غم طاری ہوتا ہے مگر اس طرح جیسے تیز پرواز طائر کا آبِ رواں پر بھاگتا ہوا عکس۔ لیکن ہمارا دل اس کا مہبط اور مسکن نہیں بن سکتا۔ ہم "لاتحزنوں" کے دائرے کے لوگ ہیں، جو غم ہی پر موقوف نہیں، عام دنیا اور تمام علائقِ دنیا کو گرد کی طرح جھاڑتے رہتے ہیں۔ ہم تمام آلام کو چیلنج دیتے ہیں۔

---

[1] محمد رضا کاظمی صاحب نے مجھے بتایا کہ جوش صاحب نے جن کو میاں کہا ہے وہ نواب زادہ محمد مہدی (ایم۔ ایل۔ اے) ہیں جو چھوٹے نواب کے صاحبزادے اور پٹنے رئیس اعظم بادشاہ نواب کے بھتیجے تھے۔ (مرتب)

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اس لئے اے میرے دبلے پتلے نازک اندام مفکر دوست، جوتی کی ناک پر مارو انتشار و الم کو پھریری لو، اٹھ کھڑے ہو اور سیدھے ہاتھ کی مٹھی کو زور سے بند کر کے آسمان کی طرف اٹھاؤ، اور بائیں ہاتھ کو شہیدوں کی طرح ہلا ہلا کر قہقہہ مارو............

تمہارا عاشق صادق
جوش

بابا ذہین شاہ تاجی کے نام

نامۂ کفر از اسلام آباد

قبلہ ذہین شاہ بابا،

ڈھائی بجے، رات کو، حسبِ معمول، بیدار ہوا تھا، اب چار میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ ہمارے پرہول کرۂ ارض کا حقیقی رنگ، یعنی گھپ اندھیرا، زمین و آسمان کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور نیلے سپہر کا اتھاہ سناٹا بول رہا ہے۔

میں آج کل گھر میں تنہا ہوں۔ پورا خاندان، بیوی سمیت، کراچی میں ہے، اور میں چغد کے مانند گنبدِ افراسیاب پر بیٹھا نوبت بجا رہا ہوں ------- یہ سچ ہے کہ میں خلوت پسند آدمی ہوں مگر شام کے وقت جلوت کو جی چاہنے لگتا ہے، اور اس بناء پر جب آفتاب غروب ہونے لگتا ہے، تنہائی کی اُداسی میں، میرا دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔

خدا کی "بے پایاں" رحمت نے آثار ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ مجھ پر انشاء اللہ، آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں دل کا دورہ ضرور پڑے گا، تنہائی میں کچھ لمحے تڑپوں گا اور پھر مر جاؤں گا۔ خس کم، جہاں پاک۔ بچپا کر آنکھیں بند کر لیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا، لیکن، آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حیاتِ انسانی ایک عبرت ناک ٹریجڈی، اور کرۂ خاکی ایک ہول ناک مقتل ہے۔

جہاں، بسمل گہہ درد است، آسائش کہ دید، ایں جا
بقدرِ سخت جانی، ہر کسے، برخود تپید ایں جا

آسمان زمین، اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مرض حیات کا واحد علاج، موت ہے۔

حزیں، از پائے رہ پیما ، بسے آشفتگی دیدم
سر شوریدہ ، بر بالین آسائش رسید ایں جا
(کتبۂ لوح مزار حزیں)

بابا صاحب، حقائق بے نہائیت تلخ ہیں، کون ان سے منہ موڑ سکتا ہے۔۔۔اقوال واساطیر سے ہم تا کجے فریب کھائیں، اور تا چند اوہام آبائی کے سامنے سر جھکائے رہیں۔ قبلہ وکعبہ، آپ بڑے مزے میں ہیں۔ رومی وغزالی آپ کے سامنے بانسری بجا رہے ہیں، تخیلات اور تاویلات کی وجدانی دیواریں، آپ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ آبائے ذوالاحترام، پھولوں کی چادر، آپ کے سر پر تانے ہوئے ہیں، اور اولیائے کرام، آپ کو لوریاں دے رہے ہیں اور اس بنا پر آپ اس دوزخ زندگی میں بیٹھے، جنت کی ہوائیں کھا رہے ہیں لیکن میں نامراد، منطق کے تپتے سورج اور دلائل کے چمکتے نیزوں کے سامنے سینہ عریاں کئے کھڑا ہوں مجھ سے، ہاں مجھ سے پوچھئے کہ یہ کارخانہ عالم کیا ہے، اور اس کارخانہ کا جنرل منیجر کیا ہے۔

ایں پسر سید کہ بر غالب ناکام، چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ ، خداوند نہ داشت

کہتے ہیں کسی بادشاہ کے ملک پر اس کے حریف نے چڑھائی کی، بادشاہ نے، دوسری پلٹنوں کے ساتھ ساتھ، لانبے تڑنگے ہیجڑوں کی بھی، ایک پلٹن بنائی، اور اس کو میدان جنگ میں بھیج دیا۔ دشمن کی فوج ان ہیجڑوں کے قد وقامت دیکھ کر ہراساں ہوگئی، سالار فوج نے جب یہ سماں دیکھا تو اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لئے، اس نے گرجتی آواز میں نعرہ لگایا کہ اے بہادرو، ٹکڑے اُڑا کر رکھ دو، ان ہیجڑوں کے۔۔۔ (دشمن کے سپاہ سالار کو یہ مطلق پتا نہیں تھا کہ وہ دراصل

ہجڑے ہیں، اس نے تو یہ لفظ "بزدلوں کے معنی میں استعمال کیا) ہجڑوں نے، جیسے ہی یہ نعرہ سنا، تلواریں پھینک دیں، پلّو سر پر ڈال لیے اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے گانے لگے "قربان جاؤں، پہچان لیا" "قربان جاؤں، پہچان لیا" "قربان جاؤں، پہچان، لیا۔

اسی طرح، تفکر کی زمین پر کھڑے ہو کر جب میں نگاہ بغاوت اٹھاتا اور چلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ دھوکا ہے تو، آسمان سے آواز آنے لگتی ہے "قربان جاؤں، پہچان لیا" "قربان جاؤں، پہچان لیا" "قربان جاؤں، پہچان لیا"!---------- تا تا تھیا، تا تا تھیا، مان لیا، قربان جاؤں پہچان لیا۔

میں ہوں آپ کی ذات، اور صرف ذات سے محبت، اور بے پناہ محبت کرنے والا، ۔ جو نجی

رعد آفاق نوش

۲۲۔۷۔۷۲

O

راغبؔ مُرادآبادی کے نام

Josh Malihabadi

OLD SECRETARIATE
DELHI.

۷-۲-۵۵

حضرۃ راغب!

آپ حضرات کے واسطے لالہ سری رام کو دہلی ولائل پور کے مشاعروں میں مدعو کرنے لئے جان دار طور پر لکھ دیا ہے، اور قوی امید ہے کہ میری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگی۔

انتہائی خبیث قسم کے نزلے میں گرفتار ہوں، اندیشہ ہے کہ زیادہ لکھ نہیں سکوں گا۔ آغا سے کہہ دیجئے کہ وہ نقوی صاحب یا ربانی صاحب سے، بینک والوں سے یہ کہلا دیں کہ انکم ٹیکس نہ وضع کیا جائے۔ اور معاملہ طے ہوتے ہی روپیہ دہلی بھجوا دیں اگر انکم ٹیکس معاف نہ ہو پھر بھی ٹیکس ادا کرنے کے بعد، جو کچھ بچے وہ یہاں روانہ کر دیں۔

سراپا اضمحلال
جوشؔ

O

میاں ممتاز دولتانہ کے نام

بندہ نواز، تعارف کے بغیر، خط لکھنا، خلافِ ادب ہے، لیکن دو وجوہ سے یہ ارتکاب کر رہا ہوں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میرے مخلص و محبوب دوست سلامت علی خاں (حاملِ رقعہ) نے مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ میں آپ کو خط لکھوں، اور، دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ، مجھ کو اس امر کا علم ہے کہ آپ، علم دوست ہیں، اس لئے خط لکھنے میں جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

اب رہا یہ امر کہ میں آپ کی خدمت میں، کیوں خط لکھ رہا ہوں۔ سو، جنابِ والا، سلامت علی خان کی زبان سے وہ درخواست سماعت فرمالیں۔

اگر، آپ نے، براہِ کرم، ان کی بات مان لی، تو، ہر چند آپ کا شکر گزار تو ضرور رہوں گا مگر اس پر مجھے قطعی حیرت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نوعیت کی درخواست قبول کر لینے کی، آپ سے قوی توقع رکھتا ہوں۔

میری یہ آرزو ہے کہ میرا یہ خط، آپ کو بہمہ وجوہ، تن درست، بشاش اور مع الخیر پائے۔

نیاز مند ------ جوش ---------- (ملیح آبادی) ---------- ۱۷ مارچ ۱۹۷۶ء، کراچی

(بشکریہ جناب مظفر عباس فرزندِ منور عباس ایڈووکیٹ مرحوم، کراچی)

خورشید علی خاں کے نام

مکتوب کا فراز اسلام آباد

حضرت خورشید

سورج ڈوبنے والا ہے، اور میں کانپتے ہاتھوں سے، آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ یعنی

شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

بیماری سے اس قدر نڈھال ہوں کہ ہاتھ جما جما کر لکھ رہا ہوں، پھر بھی حروف کی شکلیں بگڑتی چلی جا رہی ہیں۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ اگر خدانخواستہ، زندہ رہا، تو کل لکھوں گا۔

لیجئے، تاریخ بدل گئی، آج دوسری فروری ہے، اور حضرت اکبرالہ آبادی کے بقول،

افسوس ہے کہ زندہ ہوں، کہنا پڑا ہے حال
کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

کے مطابق آپ سے اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔ آج خلافِ معمول، دیر اور بہت ہی دیر سے بیدار ہوا۔ رات کو سوا سات بجے، تکیے پر سر رکھ دیا تھا، بہت دیر میں نیند آئی، دماغ سوتے میں، تمام رات باتیں کرتا، اور میرے آخری مجموعۂ کلام، محمل و جرس، کا دیباچہ لکھتا رہا۔ نیند کا رشتہ، بار بار ٹوٹتا اور جڑتا رہا---------- اب، خدا خدا کر کے سات بجے بیدار ہوا، اور کراہ کراہ کر خط لکھ رہا ہوں ______ بات یہ ہے کہ میرا دل اب آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے، بھوک بند ہو چکی ہے، سانس کھینچ کھینچ کر لیتا ہوں، ناتوانی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ جی اس قدر اداس ہے کہ خوش مزاجی مفقود ہو چکی ہے۔ فانی کی طرح چپ چپ اور مغموم رہنے لگا ہوں۔ خون اور پیشاب کا امتحان اور ایکس رے سے کسی خاص مرض کا پتہ نہیں چلتا، ڈاکٹر کہتا ہے

کے آپ اعضائے رئیسہ نارمل ہیں۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ میں، آہستگی کے ساتھ ختم ہوتا اور بجھتا چلا جا رہا ہوں، چوں قضا آید۔ طبیب ابلہ شود۔ اس بجھاوٹ کے باوجود، ارادہ کر رہا ہوں کہ ہفتہ عشرے میں کراچی آ کر، آپ سب سے مل لوں، اور آخری بار سب کو گلے لگا لوں بہت دن سے دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ۱۹۷۳ء میرا آخری سال ہوگا۔ سو، بحمد اللہ اس کے آثار اب ظاہر ہو چکے ہیں۔

ہائے میری فتنۂ آخر الزماں بھی، تقریباً ایک سال سے بیمار ہے، اور اس کی بیماری کا تسلسل، گھن کی طرح، میری زندگی کو چاٹے جا رہا ہے۔

ہم تبرک ہیں، بس اب کر لے زیارت مجنوں

آپ کا چاہنے والا ------ جوش مرحوم ---- یکم فروری ۱۹۷۳ء ------ سر شام

O

درخشاں باد حضرت خورشید

آپ کا نفسیات میں اُلجھا اور بُجھا ہوا خط ملا، پڑھ کر، جی گھبرانے لگا۔

ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں، مجھ کو، از روئے حساب، اٹھنا چاہیئے تھا، ڈھائی بجے صبح کو، ڈیڑھ گھنٹے پیش تر بیدار ہو گیا۔ کچی نیند میں بیدار ہو جانے کے باعث، دماغ سارا اونگھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا کسی بوڑھی عورت کی آغوش میں بھنچا ہوا، اوبھی اوبھی سانسیں لے رہا ہوں۔

کچھ نہ پوچھیے کہ یہ گذشتہ پہاڑ، سے چھ مہینے کیسے گزارے۔ ان پورے چھ مہینوں میں بالکل تنخواہ نہیں ملی۔ اور وہ بحرانی عالم رہا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میری جگہ، دوسرا ہوتا، تو لوگوں کو ڈھیلے مارنے لگتا۔

بارے خدا خدا کر کے اب بھٹو صاحب نے تعلیمات کی وزارت میں تقرر کر دیا ہے اور پچھلی تنخواہ بھی مل گئی ہے۔

یہاں ایک "اکاڈمی آف لیٹرز" قائم کی جانے والی ہے، میں نے قدرت اللہ صاحب شہاب سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے کام لیں، انہوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں آپ سے اس کی اسکیم لکھا کر۔ انہیں دکھاؤں، تاکہ کام آگے بڑھ سکے۔ اب آپ اس اکاڈمی کے تمام مقاصد اور ضوابط لکھ کر، مجھے جلد بھیج دیں اس وقت دماغ سویا ہوا ہے، قلم چل نہیں رہا ہے، ذہن پر ایک ڈھکن سا رکھا ہوا ہے۔ آپ نے شہاب صاحب کو جو اسکیم دی تھی، اسی لائن پر دوسری اسکیم مرتب کر دیجئے ------- ابھی کراچی آنے کا قصد نہیں ہے۔ صالحہ کا فون آیا تھا بلانے کا۔ لیکن کیسے جاؤں ------- چھ مہینے سے لاہور بھی نہیں گیا ہوں، اس سے آپ میری مجبوریوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ارے بڑی گھٹن ہے طبیعت میں کانوں میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی ہے، سناٹا، سائیں سائیں کر رہا ہے۔

نیاز مند --------- جوش ----------- ۳ نومبر ۱۹۷۳ء، اسلام آباد

O

افقِ اخلاص کے تاباں خورشید

------- پائندہ، تابندہ ور خشندہ[1] باد

آپ اکاڈمی کا مقصد دریافت کرنا چاہتے ہیں، سو، بندہ پرور اس کا مقصد، انقباضِ جہل و انشراحِ علم کے سوا، اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر، فلموں، ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درسگاہوں، مقالوں، جلسوں، تصنیفوں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

چالاک صوفیوں اور مجذوب شاعروں نے، قوالوں کی "آ ہے وا" اور مشاعروں کی سبحان اللہ کی وساطت سے، عشق و جنون کو ابھار، اور عقل و شعور کو بھینچ کر بالعموم ایشیاء اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کو، جذبات کی افیون پلا پلا کر، انتا غفیل کر رکھا ہے، اس غوطے سے لوگوں کو جگانا اور حکمت

---

[1] رخشندہ کی "ہ" میں اشباع کا عیب ہے۔ (جوش)

و منطق کی راہ پر چلانا، ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اقوال واساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے ڈھرّے پر ڈال دیا ہے کہ ہم، بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا، بچھونا بنا چکے، اور عقاید کا دودھ پی پی کر، تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں، ان خرافات کے جادو گھر سے، انسان کا نکالنا سب سے بڑا اشرف معجزہ ہے۔

آپ، انہیں باتوں پر نگاہ کر کے، اکاڈمی آف لیٹرز کا ڈھانچہ تیار کریں۔ اور، ایک ہفتے کے اندر بھیج دیں۔ تا کہ میں آپ کو یہاں بلا لوں۔

جی ہاں، اب وہ اگلی سی معلقیت باقی نہیں رہی ہے، بال و پر نکل آئے ہیں، لاہور جانے کی طاقت آ گئی ہے۔ اُم الشعراء کی آمد کا انتظار ہے، وہ آلیں، تو لاہور جا کر کوئے جاناں کا طواف کر آؤں۔ اس سفر میں آپ میرے تصوری ساتھ ہوں گے۔ اور جب چلنے لگوں گا تو، پہلے ہوٹل، ''فلیش مین'' جا کر، آپ کی معشوقۂ ملتاز کو بھی، آنکھوں میں رکھ کر، لاہور لے جاؤں گا۔ تا کہ اثنائے سفر میں آپ کا دل بشاش رہے۔

کل، رات کو ایک شعروسخن اور نا و نوش کی محفل میں شریک ہوا تھا۔ سامعین خام تھے، داد تو، سب نے نہایت چیخ چیخ کر دی، مگر ان کی آنکھوں میں، چونکہ سخن سنجی کی دمک نہیں پائی، اس لئے اہلِ بمبئی کے بقول ''مجا نہیں آئی''---------

------میں، شائد مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔ میر انیسؔ نے فرمایا ہے کہ

جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے، یہاں تو یہ عالم ہے-----------

جو آ کے نہ جائے، وہ جوانی دیکھی

اچھا، اب ٹہلنے کا وقت آ گیا۔ آسمان کی سیاہی پر، ہلکی سی گلابی سفیدی آ چلی ہے۔

۱۲۔ ۱۱۔ ۷۳۔ اسلام آباد

جوشؔ، ۲۰۸۔ الیف۔ شالی مار ۸/۱

بڑا غضب کیا خورشید علی خاں آپ نے، اچانک اپنی رخصت کی خبر دے کر، مرجھا کر رکھ دی آپ نے پھول سی شگفتہ صبح۔ ابھی چار بجے بیدار ہوا، میز پر آپ کا خط رکھا ہوا تھا۔ لفافہ چاک کر کے پڑھا، دل چاک چاک ہو گیا۔ طے تو یہ ہوا تھا کہ ہم دونوں ساتھ چلیں گے یوزپ، لیکن آپ نے تنہا جانے پر کمر باندھ لی۔

سرد بیمینا ، بصحرای تروی
سخت بے مہری کہ بے ما می تروی

آپ کے بچھڑ جانے کا اس قدر دھکا لگا ہے کہ خط لکھ رہا ہوں اور حروف کی شکلیں مسخ ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ارے ایکا ایکی یہ اشتلا کیسا کھڑا ہو گیا کہ آپ اس قدر جلد جا رہے ہیں، کچھ روز تو توقف کیا ہوتا۔ ممکن ہے ہمارا ساتھ ہو جاتا۔

اگر آپ اس قدر جلد یورپ چلے گئے تو لکھ رکھیئے میری یہ پیش گوئی کہ جب واپس آئیں گے دکان نہیں پائیں گے۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہوگی۔ اور کوئی وجہ معاش باقی نہ رہی ہوگی۔ جائیے، جائیے، میرا دل توڑ کر جائیے، آپ جب یورپ سے پلٹ کر آئیں گے، مجھے نہیں پائیں گے۔

یہ میرا آخری خط ہے۔

آپ کی رخصت سے بوکھلایا ہوا،
جوشؔ
یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء، اسلام آباد
صبح ساڑھے چار بجے، آغاز سرما ------- سلام آخری

بارہا جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں۔ لیکن جب یہ سوچا کہ آپ، بربنائے بُخل، جب مجھے کبھی، فون ہی نہیں کرتے تو، پھر میں خط کیوں لکھوں۔

کل، دوپہر کو آپ کا خط آیا۔ اس لئے، مجبوراً لکھ رہا ہوں، جی ہاں، مجبوراً دل، اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہے کہ جواب ٹال جاؤ، بخیلوں سے کیسی رسم وراہ۔

بخیل ، از بود زاہد بحر و بر
بہشتی نہ باشد، بحکم خبر

اس وقت بیس منٹ ہیں، دو بجنے میں، رات اندھیری ہے۔ محلّے کے کسی مکان سے ابھی شور کی آوازیں بلند ہوئی تھیں، اب سناٹا طاری ہے۔ سامنے کی کھڑکی سے، کوئی مجھے گولی مار دے گا، بارہا یہ خیال آرہا ہے۔ اچھا ہے، کوئی اللہ کا بندہ، گولی مار دے اور اس ہر آن دھڑکنے والے دل کو سکون بخش دے۔

جی ہاں، بہت جی چاہ رہا ہے ہندوستان جانے کو، آپ کا سا بخیل ساتھ ہوگا، تو، کروٹ کروٹ حوریں ہوں گی ...... لیجئے پھر آگیا پیار آپ پر، ہو نہ ہو، میں بھی اندر سے، تھوڑا بہت بخیل ضرور ہوں گا ...... کند ہمجنس با ہمجنس پرواز۔

لاہور، مکمل خاموش ہے۔ نہ پیام ہے نہ سلام، دل کم بخت رُندھا گھٹا جا رہا ہے، سانس اٹک اٹک کر آرہی ہے، یہ خوشی جان لے کر چھوڑے گی۔ دونوں پاؤں پر ورم آگیا ہے، لوگ کہتے ہیں، علاج کیجئے یہ بڑی خطرناک علامت ہے، میں کہتا ہوں، جوتی کی نوک سے، کل آنے والی موت آج ہی آجائے۔ کون سے لڈو بٹ رہے ہیں اس حرام زادی زندگی میں!۔

لڈو بٹنا تو در کنار، یہاں تو، برچھے لگ رہے ہیں، دن رات کھچا کھچ۔

کاش میں، سنگ دل خورشید علی خاں ہوتا، جو کہ اپنے چاہنے والی کو، ایک پھریری لے کے، بھلا دیتے ہیں۔ ہائے شقی ہونا، کتنی بڑی نعمت ہے۔ اے اللہ، مجھ پر کرم فرما، اور میرے سینے کو، شمر کا دل عطا فرما دے۔

ہوا میں خنکی تیر رہی ہے۔ اور میرے دل میں اَلاؤ جل رہا ہے، اَلاؤ، سناٹا، فضا کا احاطہ کئے

ہوئے ہے۔ اور میرے سینے میں، قیامت کا شور برپا ہے اور اس قدر کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کروڑوں ایٹم بم پھٹ رہے ہیں۔ اور تمام گلی کے کتے بھونک رہے ہیں مجھ پر، میں حسین ہوں، اور تمام کرۂ ارض کربلا ہے۔

پھر بھی داد دیجئے، میری سخت جانی یا بہادری کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا ہوں، انفس و آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور ملازمت کے دفعتے بھی سہتا ہوں ہر چند زندگی تین عدد موذی سیموں، یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہے پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا، اور بر ''باپوش قلندر'' کے نعرے لگاتا رہتا ہوں۔

خورشید کے سے ''اجمل الناس'' کا چاہنے والا
جوشؔ جس کا دین دنیا دونوں میں منہ کالا

۱۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء .... از کفرستان اسلام آباد
پونے تین بجے

یوں نیند کا پیمانہ پیا ہے تو نے
تھپتھپا کے، پلکوں کو سیا ہے تو نے
مَل مَل کے، ہتھیلیوں سے، نیم آنکھیں
آنچل نظروں کا چُن دیا ہے تو نے

○

اللہ، اللہ، یہ کراہیں تیری
ہر آن! یہ سسکیاں، یہ آہیں تیری
اے رشکِ سمن، کہیں نہ کٹ کر رہ جائیں
پلکوں کے جھپکنے سے نگاہیں تیری

○

مکھڑا ہے دھواں دھواں ، نظر ، غرقِ گداز
لِلّٰہ، نہ رو، نہ رو، مری پیکرِ ناز
میرے دل پہ چلا رہی ہے چھریاں
تیری ، یہ ، ہچکیوں سے کٹتی آواز

○

نیندیں کیا کیا دھواں بنائیں ہم نے
آنکھوں کے الاؤ میں جلائیں ہم نے
جھیلی ہیں ، جدائی میں وہ راتیں بھی کہ جب
آنچیں اوڑھی، لَویں بچھائیں ہم نے

○

الحفیظ ، لِلّٰہ ، یہ آنچوں کا خروش
رگ رگ ہے، شرارہ خرمن و شعلہ فروش
اف ، دل میں وہ آگ ہے کہ میرے نزدیک
دوزخ آتا ہے تاپنے کو اے جوشؔ

○

سنکی جو ہوا جاگے اُٹھے ہنگامے
بجتے لمحات نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی ، سرِ بزمِ طرب
بھیجے گئے ہچکیوں کو دعوت نامے

○

خود حسن جب آشفتہ نوا ہوتا ہے
آفاق میں اک حشر بپا ہوتا ہے
کانٹوں سے جو زخمی ہیں وہ یہ کیا جانیں
ڈس لیتا ہے جب پھول تو کیا ہوتا ہے

(اب رباعیات لکھنے کے بعد چارج گئے

O

مکالمہ

مابین ـــــــ شبیر حسن خاں

اور

جوشؔ ملیح آبادی

○ شبیر حسن خان صاحب --- فرماتے ہیں۔ ہائیں۔ یہ کیا دیکھ رہا ہوں ارے یہ کس گلی میں، دکھتے گھٹنے، اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹہل رہا ہے او باغی اور بھگوڑے جوش۔ فرقِ مبارک پر ماہ و سال کے یہ انبار اور چشم بد دور یہ طفلانہ رفتار۔ اللہ اللہ یہ غروب کا ہنگام اور نام خدا یہ کوچہ طلوع میں خرام۔ یہ خارستان اضمحلال اور یہ گلگشتِ کوچہ گل عذار۔ تجھ کو گیسوؤں کے پیچ و خم سے نکالا اور عقدہ ہائے کائنات کے سلجھانے کی راہ پر ڈالا۔ تجھ کو افلاک کے حواس چھِک لینے والی چکا چوند کے میدان سے بچایا۔ اور ثوابت وسیار کے آنکھیں کھول دینے والے دائرے میں لایا۔ تیرے افسوں فروشِ دل کو بجھایا اور تیرے طاق میں آفتاب دماغ جگایا۔ تجھ کو مجنوں کے گلی ڈنڈا کھیلنے کے میدان سے ہٹا کر سقراط کی دانش گاہ میں داخلہ دلایا اور چار دن میں سفیدی کی طرف مڑ جانے والی کالی زلفوں کی خواب آور چھاؤں سے اٹھا کر تجھ کو علم و نظر کے ادبی سائے میں بٹھایا۔ لیکن اے رامش و رنگ کے رسیا کھلنڈرے جوشؔ تو پھر بھی راہ راست پر آتا تھا نہ آیا (پورا محاکمہ کیا ہے تخی کے ساتھ

)اور ایک الھڑ کی صرف ایک موج تبسم کی پکار سن کے اگاڑی پچھاڑی تڑا کر جادۂ حکمت سے پل بھر میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اور بالکل اس لونڈے کی طرح جو استاد کا تھپڑ کھا کر مکتب سے اس طرح دبدبا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کی ایڑیاں اس کی کمر پر بجنے لگتی ہیں۔۔۔حیف صد حیف کہ تیری باہوں اور گودوں پر جان چھڑکنے والی شاعری نے تجھ کو مجھ سے چھین لیا۔ افوہ! یہ کم بخت شاعری، یہ بلائے بد شاعری، یہ بلّیوں اُچھلتی، دندناتی، کودتی، وَلولاتی، پھاندتی، پھلانگتی، کلکلیں بھرتی، ہوائیوں کی طرح اُڑتی لٹوؤں کی طرح گھومتی اور بگولوں کی مانند لکراتی شاعری۔ یہ چنچل، چلبلی، شہابی، چچھورر، چٹوری، چھلاوا، اُچھال چھکا اور ادماتی چھوکری شاعری جو ہر صبح کو نئی نئی وادیوں میں جھومتی، ہر رات کو نئے نئے چاندوں کو چومتی، ہر آن نئے نئے مکھڑوں کے بوسوں کو لبوں کے تیغے میں ٹونچتی نئے نئے ساحلوں پر منڈوے چھواتی، نئی نئی پائیلوں کو جھنکاتی، نئی نئی گلیوں میں دھونی رماتی، اور جب اس چٹاخ پٹاخ کو نیچے بیٹھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے تو آسمان کی طرف اشارہ کر کے گانے لگتی ہے۔

در ہیچ مقام نہ گذارد بہ درنگے
از بوئے بہ بوئے برد از رنگ بہ رنگے

افسوس اس متواتر دھمال اور مسلسل دھماچوکڑی سے کبھی نہ تھکنے والی اور ہر اودھم کے بعد تازہ دم ہونے والی چھوکری کے مزاج کی رفتار ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو اس کو رنگینیوں کی غذا سے محروم کر دیا جائے تو وہ خون تھوک کر مرجائے۔ اور اس مدماتی کو اگر ایک آن کے لئے بھی رت جگوں کے ہمہموں، رنگینیوں کے زمزموں، چڑیوں کی چوں چوں، سارنگیوں کی روں روں، شراب کے پیالوں اُکھڑوں کے گالوں، پھولوں کی گلیوں، رنگ رلیوں، تانوں کے ہلکوروں طبلے کی ٹکوروں، گوپیوں کی ہولیوں گوریوں کی ٹولیوں، بازاروں کے بجتے کٹوروں، بالیوں کی انگڑیوں کے کھنکتے ڈوروں اور چٹکلوں، چہچہوں، چوکڑیوں، چھم چھماہٹوں قہقہوں، قلقلوں، قلقاریوں، سیجوں اور باہنوں، بوسوں، برکھا کے گیتوں پیت کی ریتوں، تانگوں ٹونگیوں اور میلوں ٹھیلوں سے جدا کر دیا جائے تو یہ چھوکری دریا سے نکلی ہوئی مچھلی کی مانند ساحل حیات پر تڑپ کر دم توڑ دے

گی۔ کاش اے جوش! تو نخولیا ہوتا، مسخرہ ہوتا، مجذوب ہوتا، میراثی ہوتا، مستری ہوتا، مداری ہوتا، بالیشیا ہوتا، مالی ہوتا، موچی ہوتا، مہتر ہوتا، مولوی اور مفتی ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا لیکن شاعر نہ ہوتا۔

○ جوشؔ !---------------- اللہ اللہ آپ کے سے حلیم کی زبان اور ایسے ہیجانی الفاظ کا طوفان آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں جو بھی جی میں آئے کہہ لیجیے پھر بھی خطا معاف اتنی دقیقہ سنجی کے باوجود آپ اس بات کو پا نہیں سکے کہ اس سراپا ناز کی نیاز مندانہ موج تبسم کی پکار پر ایک میرے سے شاعرانہ مزاج رکھنے والے کا تاب حکمت سے فرار مطلق ارادی نہیں قطعاً اضطراری عمل تھا اور کسی اضطراری عمل پر احتساب وسزا جائز نہیں۔ بندہ پرور مجھ سے کہیں زیادہ آپ اس نا قبول حقیقت کبریٰ سے واقف ہیں کہ یہ پورا نظام ارض وسماوات اور تمام نا قابل شمار اشیائے کائنات بے نہایت سختی اور انتہائی دشمن بے مروتی کے ساتھ بکھرے اور جکڑے ہوئے ہیں علت و معلول کی ناشکستنی زنجیر میں اور کسی فرد کو بھی خواہ وہ کتنا ہی بے پناہ شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو یا سب سے بڑا طرم باز خاں ہی کیوں نہ ہو یہ مجال نہیں کہ علت ومعلول کی اس زنجیر کو توڑ یا اس کو توڑنے کا تصور بھی کر سکے۔ اس بے رو رعایت حلقہ جبریت میں طفلانہ مفروضے کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی کہ انسان چونکہ مادر قدرت کا سب سے چھوٹا اور اس بناء پر سب زیادہ لاڈلہ بچہ ہے اس لئے قدرت نے مادرانہ شفقت کے جوش میں آ کر اپنے اس دُلارے کو نظام شمسی کے حلقۂ جبر سے نکال کر میدان قدرت میں گلگشت فرمانے کی اجازت دے دی اور اس سوتیلی دنیا میں اے میرے سگے بیٹے جو جی چاہے سو کر کی اجازت دے دی۔ آپ خود اس بات کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ہر فرد کے دماغ کی انفرادی ساخت اس کے خانوں کی تنگی وفراخی اس میں بھرے ہوئے مصالوں کی کمیت وکیفیت، عناصر ترکیبی کی مقدار وعددیت، جذبہ عقل اور تحمل کا عدم توازن، فرد کا ذاتی میلان، قوام کی پختگی و خامی، فطری مرغوبات ومکروہات کی کشمکش اور نسلی ماحولی غذائی، موسمی تاثرات کے پیدا کردہ مزاج کی نوعیت ہی اس پر حکومت کرتی ہے جدھر جی چاہتی ہے اس کو لے جاتی ہے بعض اپنی سرکار ذات کے خوشامد خور نے یہ دعویٰ کرتے چلے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہے سو کر سکتے ہیں کاش ان بھولوں کو معلوم ہوتا کہ چاہنا ہی سرے سے ہمارے اختیار میں نہیں۔ ار۔۔۔

غضب خدا کا ترس کھانے کے بدلے آپ اس نامراد کو ڈانٹ پھٹکار رہے ہیں۔ جس بدبخت کے سر پر قدآدم بجلی گر چکی ہو، جس کی عقل کے بخیے اُدھیڑ ڈالے گئے ہیں، جس کے حواس کو جھلسا کر رکھ دیا گیا ہے، جس کی عقل اس کی چھری سے ذبح کر ڈالی گئی ہے۔ جو تمام یونان کے سیاحوں کی فہرست سے خارج کر کے نجد کے بیداریوں کے رجسٹر میں درج کر دیا گیا ہے اور جس کو اس دوشیزہ کی غمگین وغم انگیز شاعری نے جس کی ذات خود موضوع شعر ہے مرکز جو اس سے پچھا اس طرح گرا دیا ہے کہ اور تو اور اب وہ خود اپنے سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ گوریوں کے گزند رسیدہ مظلوم پر سب وشتم فرمانا آپ جیسے دانا کے شایانِ شان نہیں۔

○ شبیر حسن خان ! ارے اس قدر مظلوم نہ دکھا اپنے کو یہ عذاب جو تجھ پر نازل ہے تو نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر لادا ہے۔ اس آگ کو جو تیرا احاطہ کیے ہوئے ہے تو نے ہزاروں جتن کر کے خود سلگایا ہے۔ مجھ کو پتہ چل چکا ہے اے جوش کہ جب کبھی بہ تقاضائے بشریت مجھ پر کلفت، ربودگی یا خواب گراں کی کیفیت طاری ہوئی ہے تو نے معاشقے سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے اور اس نادان کے دل کو موہ لینے کی نیت سے اس کو جھوم جھوم کر اپنا کلام سنایا تو نے اس کی نوبصارت کنواری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو اس سوزندہ نگاہ سے دیکھا ہے جو سنگ وآہن تک سے لو نکال دے سکتی ہے۔ تو نے اس نادان کو اپنے سینے سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر سیکڑوں بار دبایا ہے اور یہاں تک کہ تو نے اپنے دھڑکتے دل کے ضربات اس کی رگ رگ میں دوڑا دیے ہیں۔ تو نے اپنی شدید چسپیدگی سے اس کو موسم بہار سے پہلے چٹکا دیا ہے اور اس عمل تواتر سے تو نے اپنی دانائی اور اس کی نادانی دونوں پر ظلم ڈھایا ہے اور اس دہرے ظلم کے باوجود اپنے کو مظلوم کہہ رہا ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

○ جوش ! ارے سر پیٹ کر مرجانے کی بات ہے آپ کا یہ غیر حکیمانہ ارشاد کہ میں دیدہ ودانستہ اس بلائے بے پناہ میں گرفتار ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی طینت وسرشت پر حاوی ہو کر اپنے ارادے سے اقدامات کیے ہیں حالانکہ انسانی افکار و کردار و گفتار تمام تر طینت وسرشت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمارا ارادہ ایک اضطراری ... دوہوں حقیقت

نہیں رکھتا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے خالق نہیں ہیں ہماری تمام خواہشوں، تمام آرزؤں، تمام تمناؤں، تمام ترنگوں اور تمام ولولوں کا سرچشمہ ہمارے وجود کی میزانِ کُل ہماری طینت کے مجموعی فرمان سے اور ہمارے دلوں سے خود بہ خود پھوٹتا ہے اور جس وقت کسی ولولے کا چشمہ پھوٹتا ہے بارگاہِ عقل میں گھنٹی بجنے لگتی ہے اس وقت عقل اپنے حجرے سے باہر آ کر ہماری خواہش کے خط و خال کو پرکھتی ہے۔ اگر عقل کے نزدیک وہ خواہش جائز ہوتی ہے تو وہ اس کو پروانۂ راہداری دے دیتی ہے اور اگر اس کے نزدیک وہ خواہش ناجائز ہوتی ہے تو وہ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس آدمی کے جسم میں اگر عقل قوی ہوتی ہے تو خواہش کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسکو بے بس کر دیتی ہے اور اگر خواہش عقل سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے تو وہ عقل کو دھکا دے کر اس کو اس کے حجرے میں بند کر دیتی ہے اور ارادے کو جو چپراسی کی وردی پہنے برآمدے کے اسٹول پر بیٹھا ہوتا ہے آواز دے کر بلاتی ہے اس کے کاندھے پر بیٹھ کر عمل کے دائرے میں آ جاتی ہے اس تمام صورتحال سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم سو فیصد مقدور ہیں اور ایک فیصدی بھی قادر نہیں۔ آپ اس جبریت کے قانون سے واقف ہوتے ہوئے بھی مجھ سے فرما رہے ہیں کہ میں اپنی اس آشفتگی کا خود ذمہ دار ہوں یہ تو بالکل ایسی بات ہے گویا جولیس سیزر کا جگری دوست بروٹس اس پر تلوار سے حملہ کر رہا ہے اور سیزر حیرت سے اچھل کر کہہ رہا ہے (Otto Brutus) خان صاحب کسی بڑے سے بڑے دیوتا کی بھی یہ مجال نہیں کہ حسن اپنے خلعتِ ناز کو اُتار کر اور لباسِ نیاز کو پہن کر اس کے سامنے آئے اور سُرمگیں آنکھوں سے آنسو بہائے اور وہ پگھل کر نہ رہ جائے۔ خان صاحب! انصاف سے کام لیجئے اور خدا کی لگتی کہیئے۔ جب وہ دوشیزہ اترے مکھڑے سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سوگوار نہ در آتی تو کیا میں اس فتنۂ آخرالزماں کی طرف سے منہ پھیر کر جھپٹ پڑتا وضو کے بدھنے کی طرف کیا میں بیٹھ جاتا مصلے پر نمازیں پڑھنے۔ پہن لیتا جامۂ احرام اور کرنے لگتا کعبے کا طواف اور دبک کر بیٹھ جاتا کسی مفتی کے دامن کی مقدس چھاؤں میں۔

○ قمر حسن خان ! .... تو میرے بخشے ہوئے اسلحے سے مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔

کس نیا موخت علم تیر ازمن
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرو

میں ان ہتھیاروں سے زخمی ہونے والا نہیں۔

○ جوشؔ ! خان صاحب بہادر غصہ آ چکا ہے آپ کو اور اس بناء پر آپ منطق سے منہ پھیر چکے ہیں۔

○ شبیر حسن خان ! بس چبا چبا کر باتیں نہ کر۔ نہیں آئے گا میرے سامنے۔ نہیں ترک کرے گا زلفوں کی چھاؤں کو اور نہیں باز آئے گا تو جنون سے۔

○ جوشؔ ! خان صاحب آپ نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

منعم کنی زعشق وے اے مفتی زماں
معذور دار مت کہ تو اورانہ دیدئی

آپ جس چیز کو میرا جنوں فرما رہے ہیں وہ اس کے بقدر جمال نہیں۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو دیدی تحمل است
ناصح ملامتے مکنی ناشکیب را

○ شبیر حسن خان ! اچھا سمجھ گیا۔ اس لونڈیا کا زہر تجھ پر پوری طرح چڑھ چکا ہے۔ تجھ پر، تجھ حکمت کے نمک حرام پر تو پھر اے خیرہ سر جوشؔ دیکھ میرے ہاتھ کے گرز گراں کو ہوشیار، خبردار۔

○ جوشؔ ! سمجھ گیا، ہتھولی کی رنگ پھڑک چکی ہے منہ سے کف نکل رہا ہے اس پیشانی پر شکنیں پڑ چکی ہیں جس سے حکمت کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں سچ کہا ہے کسی دانائے روزگار نے کہ

پٹھان حکیم و پیغمبر ہی کیوں نہ ہو جائے اندر سے رہتا ہے پٹھان ہی۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

اور اس کے فوراً بعد اُس طرف گرز چلنے کی آوازیں اور اِس طرف سر سے ڈھل ڈھل خون بہنے کا آغاز خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوتا تھا۔

(۱۲۔فروری ۱۹۷۵ء)

O

متحدہ اُردو محاذ کراچی
کے
جلسے سے خطاب

میں اس "متحدہ اُردو محاذ" کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ ہندوستان سے اُردو کو جلاوطن کر دیا گیا ہے اور پاکستان میں اسے کوئی منھ لگانے پر تیار نہیں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایک جماعت اٹھ کھڑی ہو اور اردو کی ہمہ وقتی خدمت پر کمر باندھ لے۔

مسلمانانِ ہند کو اسلامی ثقافت اور اردو کی حمایت کے خارا شگاف نعروں سے جھنجھوڑ کر جگایا اور پاکستان بنایا گیا تھا اور ہم بڑے طمطراق سے اردو کے ڈولے کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر یہاں لائے تھے لیکن یہاں آنے کے کچھ روز بعد ہی ہمارے جذبات سرد ہو گئے اور ہم نے اردو کے ڈولے کو غار میں گرا دیا۔ اگر خدانخواستہ کچھ روز اور یہی غفلت جاری رہی تو ہماری زبان ہندوستان کی مانند پاکستان میں بھی فنا ہو جائے گی اور اگر اپنی تاریخی سخت جانی سے باقی بھی رہی تو اس کا رنگ بدل جائے گا۔ ہماری اردوئے معلیٰ، اردوئے اسفل میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی اور عالم یہ ہو جائے گا کہ بیٹے کو اس بات کا پتہ ہی نہیں رہے گا کہ ہمارے باوا جان کی زبان اصل تھی کیا۔

ان اُمور پر غور کر کے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہم ایک ٹھوس جماعت بنا کر مندرجہ ذیل

سمتوں میں آغاز کار کی طرح ڈال دیں۔

○ پہلی بات یہ ہے کہ ہم حکومت کو مجبور کردیں کہ وہ بہت جلد اردو کو دفتری زبان کا درجہ دے دے۔

○ یونیورسٹی کو اردو کا پابند کردیا جائے اور مستند ارباب علم وادب سے نصاب تیار کرایا جائے۔

○ ایک دائرۃ الترجمہ وتالیف قائم کرکے اعلیٰ تصنیفات کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علوم اور تمام اصطلاحوں کا اردو ترجمہ کرایا جائے۔

○ زبان میں جو اغلاط کا زہر سرایت کرچکا ہے اس کے ازالے کے واسطے ایک ''قاموس لاغلاط'' کو مرتب ومدوّن کیا جائے۔

○ مستند ارباب علم و ادب اور ماہر لسانیات پر مشتمل صحتِ ادب و الفاظ کی خاطر ایک ''دائرۃ الفادائے ادب'' قائم کیا جائے تاکہ ادب والفاظ کے اندر پراگندگی نہ پیدا ہوسکے۔

○ فلموں، رسالوں، اخباروں، جلسوں، جلوسوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سالانہ اجتماعات کی وساطت سے اردو کو فروغ دیا جائے۔

○ چونکہ زبان دماغ کی ترجمان ہوتی ہے اور ہم اپنے افکار وخیالات کو الفاظ کی سواریوں پر بٹھا کر سامعین کے احاطۂ فکر اور قارئین کتب کے دماغوں تک لے جاتے ہیں اس لئے جدید مفردات ومرکبات کی تعمیر کی جائے تاکہ الفاظ یعنی خیالات کی سواریوں کی قلت کی وجہ سے ہمارے افکار و خیالات گھٹیا کے مرض میں گرفتار ہوکر نہ رہ جائیں۔

لیکن اس کے واسطے ایک بہت بڑے سرمائے کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ ہم ارباب قلم بے درم ہیں، اور جن کے پاس درم ہیں ان کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ پھر اس قدر سرمایہ آئے گا کہاں سے؟ کیا حکومت ہمارے کام آئے اور ہماری تجاویز کو عملی جامہ پہنانے پر مائل ہوسکے گی۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور غور کرچکنے کے بعد صحیح سمت قدم اٹھائیں۔

----- متحدہ اردو محاذ، کراچی کے معروف شاعر اور ادیب وطبیب ڈاکٹر یاور عباس نے قائم کیا تھا۔ جوشؔ کی یہ تحریر انہوں نے مجھے ۱۹۷۹ء میں دی تھی۔ (مرتب)

غیر مُرتّب

(محاورے و معانی)

۱۔ ------- موت کے ہاتھ سے روٹی کھانا ------، بدترین شدائد کو برداشت کر کے وجۂ معاش کا حاصل کرنا۔ (میں دن بھر مشین چلاتا ہوں اور موت کے ہاتھ سے روٹی کھاتا ہوں)۔

۲۔ ------- محمدؐ ہیں قندیل عرب نہ کہ بولہب ------- ایسے موقع پر بول سکتے ہیں جب شہر کے اُن دو بڑے آدمیوں کے درمیان تقابل کیا جائے جن میں ایک کو دوسرے پر، ہر اعلیٰ تفوّق حاصل ہو۔

۳۔ ------- خاک، یا سنگ یا فولاد یا ریگ سے تیل نکالنا ------، ایسا کرنا جو ممکن نہ ہو۔

۴۔ ------- دوسروں کی رسی کے لئے تاگے کاتنا ----------، دوسروں کا کام کرنا، اپنا کوئی کام نہ کرنا۔

۵۔ ------- آسیا چکی میں داڑھی سفید کرنا ------، ڈھنیے کے روبرو بیٹھ کر داڑھی سفید کرنا۔ کم عقل و ناتجربہ کاری۔

۶۔ ------- دہی سے داڑھی سفید کرنا ------، ایضاً۔

۷۔ ------- دوسرے کے ہاتھ میں داڑھی کا ہونا ------، کسی کا دوسرے کے قبضے میں ہونا۔

۸۔ ------- آدمی ہے یا گائے کی داڑھی ہے۔۔۔۔۔۔، عجیب و غریب انسان (گائے کے داڑھی نہیں ہوتی ہے اس لئے تعجب کے مقام پر ایسا کہا جاسکتا ہے)

۹۔ ------- داڑھی کے زور سے مال بیچنا۔۔۔۔۔، داڑھی کی ترازو میں تول کے مول بڑھانا، لوگوں پر اپنے زہد کا سکہ اپنا اُلو سیدھا کرنا۔

۱۰۔ ------- داڑھی میں تول، بڑھادے مول۔۔۔۔۔، داڑھی پھٹکار، سب کا حق مار۔

۱۱۔ ------- داڑھی پھٹکارنا۔۔۔۔۔، سب کا حق مارنا۔

۱۲۔ ------- لگا داڑھی کا زور، خوب مال بٹور۔

۱۳۔ ------- تم نے میرے قوائے باطنی کو زندہ کردیا۔

۱۴۔ ------- میں اُس کا زہر اُتار دوں گا۔۔۔۔، مزاج کو اعتدال پر لے آؤں گا، غصہ ٹھنڈا کردوں گا، شہوت سے نجات دوں گا، زور گھٹادوں گا۔

۱۵۔ ------- وہ زہر کی مسواک کرتا اور زہریلے الفاظ تھوکتا رہتا ہے۔

۱۶۔ ------- ٹھنڈا زہر، چور زہر، میٹھا زہر، میٹھا زہر۔۔۔(Slow Poison) دیر اثر زہر۔

۱۷۔ ------- اس نے اپنا تمام زہر مجھ پر چھڑک دیا۔۔۔۔، غصہ اتاردیا۔

۱۸۔ ------- امیروں کی ٹوپی کے سائے میں فقیروں کا سر رہتا ہے۔

۱۹۔ ------- وہ بہادر شیر کی پشت پر کاٹھی رکھ سکتا ہے۔

۲۰۔ ------- کھوپڑی پر خُم کا توڑنے والا۔۔۔۔۔۔، بے حد شراب خوار

۲۱۔ ------- سخی کے ہاتھ کے سائے میں دنیا سوتی ہے۔ داتا کے ہاتھ کے چھاؤں جگ سوئے پھیلائے پاؤں۔

۲۲۔ ------- میرے بھروسے نہ رہو، میں تو اب سایۂ گریزاں (ڈھلتی ہوئی دھوپ) ہوں۔

۲۳۔ ------- ہاتھ ٹھوڑی کا ستون بنا ہوا ہے۔۔۔۔۔، حیرت یا فکر مند بیٹھنا۔

۲۴۔ ------- کھال ادھیڑ دینے والی باتیں ------، ایسی صاف باتیں کہ سننے والے کو اس سے تکلیف پہنچے۔

۲۵۔ ------- بات کا موقع نہ ہو تو ہونٹ سے رکھ۔

۲۶۔ ------- منہ سے بات ٹپک پڑنا ------، یکایک زبان پر آ جانا۔

۲۷۔ ------- ایک بات اور صدیوں کی واردات ------، واقعاتِ پیشیں کے بیان کرنے میں واقعات کے مانند ماہ و سال نہیں لگتے۔

۲۸۔ ------- بات کو روشن کر کے کہنا ------، صفات کے ساتھ کہنا۔

۲۹۔ ------- جو بات سنے، موتی چُنے

۳۰۔ ------- چاند مفلسوں کا چراغ ہے۔

۳۱۔ ------- دوسروں کے پانی سے سر دھلانا ------، پرانے مال کو تصرف میں لانا۔

۳۲۔ ------- غُرفے سے سر نکالو، دنیا کو دیکھو بھالو۔

۳۳۔ ------- یہ دانہ خاک سے سر نہیں نکالے گا ------، یہ سعی مشکور نہیں ہو گی۔

۳۴۔ ------- اپنے گریبان سے سر نکالو ------، ہوشیار ہو جاؤ۔

۳۵۔ ------- اپنے سر کو اس جال سے نکالو ------، اس فریب خوردگی کو ترک کرو۔

۳۶۔ ------- سر کو زانو سے اٹھاؤ ------، ہوشیار ہو جاؤ۔

۳۷۔ ------- اس خالی شیشے سے کب تک پیتے رہو گے ------، اس فریب میں کب تک مبتلا رہو گے۔

۳۸۔ ------- سر کو ہلکا کرنا ------، فارغ البالی حاصل کرنا، ذمہ داریاں کم کرنا، شراب پی لینا، غم کا غلط کرنا۔

۳۹۔ ------- وہ دونوں ایک ہی گریبان سے سر نکالے ہوئے ہیں ------، دونوں یک جان و دو قالب۔ یا شریک باہم دگر ہیں، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

۴۰۔ ------- آج کل تو وہ گھٹاؤں سے سر گزرتا پھر رہا ہے---------، بے حد مغرور ہو گیا ہے۔

۴۱۔ ------- کب تک بالوں میں سر چھپائے رہو گے-----، کب تک پردے میں رہو گے، کب تک پہچانے نہیں جاؤ گے۔

۴۲۔ ------- وہ اس طرح گردن اُٹھا اُٹھا کر بات کرتا ہے گویا دریا سے سر اُٹھا اُٹھا کر مرغابی گلے میں پانی اتار رہی ہے۔

۴۳۔ ------- سب ایک ہی تکیے پر سر رکھے سو رہے ہیں------، ایک ہی قسم کی غفلت میں جتلا ہیں۔

۴۴۔ ------- سر کو پروں سے چھپانا------، شرمندگی سے سر کو جھکانا۔

۴۵۔ ------- خورشید کا سر نکلا------، صبح ہوئی۔

۴۶۔ ------- پانی سے طائر کا سر اُٹھانا------، پانی پیتے وقت ایک لمحے کے لئے طائر سر اُٹھاتا ہے تاکہ پانی گلے سے اُتار لے، یہ قلیل وقت ظاہر کرنے کے لئے بولتے ہیں مثلاً وہ تکیے پر بس اتنی دیر سر رکھتا ہے، جتنی دیر کے لئے طائر پانی سے سر اُٹھاتا ہے۔

۴۷۔ ------- دام سے سر باہر نکالنا------، فریب سے رہائی پانا۔

۴۸۔ ------- کٹے ہوئے سر بولیں گے------، یعنی مظلوموں کے قتل کا انتقام لیا جائے گا، ظلم کی تشہیر ہو گی۔

۴۹۔ ------- ران پر سے سر پوش کا گر جانا------، اُفشائے راز ہو جانا۔

۵۰۔ ------- اب اس بات کا سر پوش اُٹھاؤ------، بھید کو ظاہر کر دو۔

۵۱۔ ------- سر کا بند ہونا------، بے ہوش یا لا یعقل ہونا۔

۵۲۔ ------- اُمید کی پیٹھ کھجانا------، امید میں مارے مارے پھرنا، (میں تمام عمر امیدوں کی پیٹھ کھجاتا رہا۔ لیکن کھجلی نہیں مٹی)۔

۵۳۔------ سر کا واپس دینا------، کسی کو بے ہوش کر کے ہوش میں لانا۔

۵۴۔------ سر کا واپس لینا------، کسی کے دام سے نکل جانا، کسی کی نوکری کو ترک کر دینا، کسی کی آرزو سے دست بردار ہو جانا۔

۵۵۔------ کسی کی ٹوپی میں سر رکھ دینا------، مطیع و معتقد ہونا۔

۵۶۔------ سر کو پھرا لینا------، عقل کے راستے سے ہٹا دینا۔

اللہ رے عقل سے مجھ کو نہ ہٹاؤ
وجدان و تجلیات کی زد پہ نہ لاؤ
اربابِ مکاشفات و اہلِ اوراد
سب کچھ لے لو، مگر سر نہ پھراؤ

صبح ۷ بجے ۱۶ منٹ
۱۶۔فروری ۱۹۶۴ء۔کراچی

○

علاّمہ رشید ترابی کی وفات پر تعزیت نامہ

میاں نصیر ترابی، سلامت رہو، ہر چند، اس کُرہ ارض پر، بفضلہٖ، ایک فرد بھی نہیں رہے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب کہ تمہارے نازش روزگار و عظیم باپ کی موت پر، خود میرا گریبان چاک، اور، خود میری آنکھیں نمناک ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں، پھر کس منہ سے، تم کو، صبر کی تلقین کروں،۔۔۔۔۔

ایسے، قوتِ برداشت کو سلب کرنے والے سانحہ پر، جب کہ زندگی کی سانس اُکھڑ کر رہ جاتی ہے، صبر کی تلقین کرنا، شقاوت نہیں تو اور کیا ہے۔؟

اور، اس بناء پر، میں یہ کہوں گا کہ رو، اے میاں نصیر، رو، جی بھر کے رو اور روتے روتے، جل تھل بھر دو،۔۔۔۔۔ اس موت پر زمین بھی رو رہی ہے، آسمان بھی رو رہا ہے، میں بھی، دل تھام کر روؤں، تم بھی سر پیٹ کر روؤ،۔

نظر اُٹھا کر دیکھو کہ تمہارے باپ پر۔۔۔۔۔۔۔۔ جو دینِ خوش گفتاری کے پیغمبر تھے۔ موت تاری کر کے، لیلائے فصاحت پر بیوگی کا عذاب نازل کر دیا گیا۔ عروسِ بلاغت کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئی ہیں شہرِ ابلاغ کو، پامال کر ڈالا گیا ہے۔ نگارِ حرف و حکایت کی نبضیں ڈبو دی گئی ہیں۔ فضائے سوگ داری سے "واحسینا" کی صدا، چھین لی گئی ہے۔ طلاقت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ معانی کی چاندنی، گہنا دی گئی ہے۔ الفاظ کی پنکھڑیاں توڑ دی گئی ہیں۔۔۔۔ خطابت کی رگوں کا خون جما دیا گیا ہے۔ جادو بیانی کی رگِ جاں، تراش دی گئی ہے۔ محراب کی زبان کو کاٹ ڈالا گیا ہے۔

منبر کو گونگا بنا دیا گیا ہے اور کھنکتے ، لہجے کی دھنک کو، توڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو ، کہ ہے شامِ فراق
میں ، یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

سوگوار جوشؔ
اسلام آباد۔۔۔۔۔۔۔۔۱۔۱۔۷۲ قبلِ طلوع

---

۱ پاکستان کے نامور خطیب علامہ رشید ترابی کے سانحہ ارتحال پر اُن کے صاحبزادے نصیر ترابی کے نام جوشؔ صاحب کا یہ خط ایک ایسے تعزیت نامے کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اُردو ادب میں نثری مرثیے ، کی صنف کو ایک جداگانہ ادبی وقار عطا کیا۔ اپنے اُسلوبِ خاص اور ندرتِ اظہار کے حوالے سے یہ تعزیت نامہ خود جوشؔ صاحب کے لکھے ہوئے تعزیت ناموں میں سے ایک ایسی اَدبی نثر کا حامل ہے جو بیکر ایک علیحدہ مزاج اور ایک مختلف و منفرد پیرایۂ خیال لئے ہوئے ہے۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں اسے ابراہیم جلیس نے عوامی عدالت کراچی میں شائع کیا تھا اور پھر یہ نایاب ہو گیا۔ جوشؔ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصلی خط مجھے نصیر ترابی سے ملا جو شاملِ اشاعت ہے یہ خط اور جوشؔ صاحب کے دوسرے تعزیت نامے راقم السطور کی زیرِ ترتیب کتاب "جوشؔ کے تعزیت نامے" میں شامل ہیں۔ (مرتب)

نواسی صبوحی خاتون کی بیوگی پر

میری بچی صبوحی۔۔۔۔۔۔

خون کے آنسو رو رہا ہوں، تمہاری بیوگی پر، کیا کروں، کیا نہ کروں میں خود کراچی آتا مگر بیمار ہوں اور نادار بھی۔۔۔۔۔۔ جسم میں دم ہے نہ جیب میں دام ہیں بہر حال جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا، تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔

بٹی۔۔۔۔۔۔ اپنا دل ٹھہراؤ، ماں کو بھی ہوش میں لاؤ، بچوں کی طرف دیکھو، مرنے والے کی یاد میں دل نہ گھلاؤ۔

جان سے زیادہ عزیز بٹی۔۔۔۔۔۔۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ ناصر صرف میرا داماد نہیں تھا بھائی بھی تھا اس پر جتنا غم کیا جائے کم ہے۔ مگر اب صبر کرو۔

صبا جانا اُدھر، تو دردِ دل کا ماجرا کہنا

تمہارا سوگوار نانا۔۔۔۔۔۔ جوشؔ

۳۰/۹/۷۷، اسلام آباد

O

پریم چند سے آخری ملاقات

میرے اور پریم چند کے تعلقات بہت دیرینہ اور انتہائی مخلصانہ تھے--------- ان کی ذات میں پریم کی بہت مٹھاس تھی، ہم دونوں جب بھی ملتے، ہمارے دل کی کلیاں کھل جایا کرتی تھیں، میری ہی طرح وہ بھی اوطان، اَدیان، لسان اور زبان کی بناء پر انسانوں میں تفریق کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ پوری نوعِ انسانی سے محبت کرتے تھے یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

یادش بخیر--------- جب میں قرول باغ دہلی میں رہتا تھا وہ ایک دن، سرِ شام، میرے پاس آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے، میں نے اس صحبت میں ان کی "نیک چلنی" پر بہت سی پھبتیاں بھی کسی تھیں اور وہ تا بدیر ہنستے رہے اور بار بار میرے گلے سے لگ جاتے تھے------- وہ میری اور ان کی ملاقات کی آخری رات تھی------- جب وہ مجھ سے رخصت ہونے لگے تو میں نے اُن کے دونوں ہاتھ! اپنے سینے سے لگا کر بے ساختہ یہ رباعی اُن کو سنائی تھی۔

کیا جانیے، اب بات ہو، یا بات نہ ہو
اس رات کے بعد، پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو کہ گلے تو مل لیں جانے والو
ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

یہ رباعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی زبردست پیش گوئی تھی، اس ملاقات کے تیسرے چوتھے روز خبر آئی کہ وہ اس دنیا سے سدھار گئے ہیں، حیرت ہے کہ بعض اوقات انسان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو بہت جلد واقعات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔

(وقت شام۔ ۷ بج کر ۱۰ منٹ------- ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کراچی)

جلالؔ لکھنوی

(یادِ رفتگاں)

میری یہ بڑی خوش قسمتی ہے اور بد بختی بھی کہ میں نے اس وقت ہوش سنبھالا جبکہ ہماری پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی، اور نئی تہذیب کی ولادت کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی تو اس لحاظ سے تھی کہ ہر چند میرے بزرگوں والا لکھنؤ اس وقت باقی نہیں رہا تھا، لیکن ابھی اس کی رنگ اُڑی ہوئی زریں محراب میں کچھ ایسی شمعیں روشن تھیں جنہیں دیکھ کر مرحوم لکھنؤ کی تہذیب کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور بد بختی اس لحاظ سے تھی کہ ان اکابر کی صحبتوں میں شریک ہونے اور ان کی آنکھیں دیکھنے کے بعد اب میں اپنے دور کے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، جن میں اپنے بزرگوں کا کوئی جوہر باقی نہیں رہا۔

ان آنکھوں کا بھی ہے لیکھ
وہ بھی دیکھا ، یہ بھی دیکھ

میرے خاندان میں سب سے پہلے معلوم شاعر میرے پردادا حسام الدولہ تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خان بہادر گویا تھے۔ اور ان کے بعد سے یہ سلسلہ میرے دادا اور میرے باپ سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے۔

میری پیدائش اُس عبوری دور میں ہوئی، جب حالیؔ، امیرؔ اور داغؔ کے چراغ، موت کی ہوا سے جھلملا رہے تھے اور میرے ہوش سنبھالتے ہی ان بجھے ہوئے چراغ کا دھواں ہوا میں لہرا کر فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ بچپن میں لکھنؤ کے جس ممتاز غزل گو شاعر کو سب سے پہلے میں نے دیکھا میر

ضامن علی صاحب جلالؔ تھے ان سے امیرؔ و داغؔ کے بعد میرے والد اصلاح لیا کرتے تھے۔
حضرت جلالؔ کی عمر اس وقت ستر بہتر سے متجاوز ہو گی۔ وہ دبلے پتلے آدمی اور دوے کے مریض تھے۔ ان کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور ایسا کہ ان کی پیری میں بھی ایک بانکپن کی آن نکلتی تھی۔

حضرت جلالؔ کی یہ ایک خاص شان تھی کہ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ ایک روز جب وہ میرے والد کے ساتھ حسین آباد کی طرف گاڑی میں گزر رہے تھے تو گاڑی جس وقت شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد کے سامنے گزرنے لگی، جلال صاحب نے میرے والد سے مسجد کی جانب اشارہ کر کے پوچھا "خانصاحب یہ کیا ہے؟" والد نے مسکرا کر فرمایا "جناب والا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" جلالؔ نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "آپ اس کا نام تو لیجئے" والد نے ہنس کر فرمایا "مسجد"۔

یہ سنتے ہی جلالؔ صاحب کے چہرے سے ایک خاص قسم کا جلال ٹپکنے لگا اور مسجد کی جانب دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے ایک عجیب ولولے کے ساتھ فرمانے لگے کہ خان صاحب اس خانہ خدا کی حرمت کو گواہ کر کے دعویٰ کرتا ہوں کہ جلالؔ کا سا شاعر نہ کبھی تھا اور نہ آج ہے، نہ کل پیدا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالباً آتش کے بعد جلالؔ ہی وہ پہلے غزل گو تھے جنہوں نے لکھنؤ کی لفظی رعایت والی مصنوعی غزل گوئی سے روگردانی کر کے غزل کو جذباتی سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان کو بھی بہت کچھ مانجھا تھا، لیکن متروکات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ اگر وہ دراز ہو جاتا تو اُردو کے گیسو مختصر ہو کر پٹوں میں تبدیل ہو جاتے!۔

میرے باپ کی یہ سنتِ جاریہ تھی کہ وہ اپنے ہندوستان کے تمام دوستوں کے پاس ہر سال آموں کے ٹوکرے بطورِ تحفہ روانہ فرمایا کرتے تھے، لیکن شعرائے لکھنؤ کی خدمت میں آموں اور دوسرے پھلوں کے ساتھ غلّہ اور گھی بھی روانہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حسبِ دستور ایک روز والد نے اپنے ایک سپاہی، محمد شیر خاں کی معرفت حضرت جلالؔ کی خدمت میں جب گھی بھیجا تو وہ (سپاہی محمد شیر خان) شام کے قریب تمتمائے چہرے کے ساتھ آئے اور والد کو سلام کیا، اور واپس شدہ گھی کے ظرف کو اسٹول پر رکھ کر خاموشی کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ محمد شیر خاں ہمارے سپاہیوں میں سے

سب سے زیادہ کٹیلے کڑوے اور تیکھے تھے ان کے متعلق والد فرمایا کرتے تھے کہ محمد شیر خاں ان آدمیوں میں سے ہیں کہ اگر ان کی ایک ایک بوٹی بھی کاٹ ڈالی جائے پھر بھی وہ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کریں گے یعنی وہ قائل ہو جانے اور اپنی غلطی کے مان لینے کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا چکے تھے۔

جب محمد شیر خان گھی کا ظرف سامنے رکھ کر چپ سادھ گئے تو میرے والد سمجھ گئے کہ وہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر آئے ہیں۔ چنانچہ والد نے ارشاد فرمایا، خاموش کیوں کھڑے ہو؟ کچھ تو سر سے کھیلو منہ سے بولو کہ آخر ہوا کیا؟ یہ سنتے ہی محمد شیر خاں نے غصے میں اپنی داڑھی کو منہ میں دبایا اور کہا کہ۔

"فِد وی، حضور کے حق نمک سے ادا ہو چکا ہے۔ یہ صرف حضور کا خیال تھا کہ میں کچھ نہیں بولا نہیں تو جلال کو مزا چکھا دیتا" والد نے بگڑ کر فرمایا "بات بتاتے نہیں اور جامے سے باہر ہوئے چلے جا رہے ہو" محمد شیر خاں نے والد کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھے تو ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "حضور جیسے ہی میں نے دروازے پر جا کر ہانک دی، جلالؔ غصے میں بھرے باہر آئے اور کہنے لگے" جاؤ، جاؤ تم کون ہو؟۔

میں نے چنا مار کر کہا، خان صاحب بہادر نے ملیاباد (ملیح آباد) سے آپ کو گھی بھیجا ہے" لال پیلے ہو کر انہوں نے کہا" لے جاؤ، لے جاؤ اس گھی کو، گھی بھیجا ہے اور تمہارے ہاتھ، جاؤ جاؤ، میں گھی نہیں لیتا، بڑے آئے گھی دینے والے۔ حضور یہ آپ کا ڈر تھا جو میں نے یہ سنا اور منہ سے کچھ نہیں بولا۔ آپ کا ملنے والا نہ ہوتا تو قرآن مجید کی قسم! مزا چکھا دیتا" اس کے دوسرے ہی روز والد مجھے ہمراہ لے کر حضرت جلالؔ سے ملنے کی خاطر تشریف لے گئے۔ محمد شیر خاں بھی ساتھ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جلالؔ نے والد سے کہا" خان صاحب خطا معاف! ان داڑھی والے کو میرے سامنے سے ہٹا دیجیے" والد نے شیر خاں کو اشارہ کیا۔ اور وہ فرطِ غضب سے اپنی انگلی کو اپنے دانتوں سے چباتے ہوئے باہر چلے گئے۔

ان کے اوجھل ہوتے ہی جلالؔ نے والد سے کہا" خانصاحب اس داڑھی والے جناور نے میری ناک کٹا ڈالی محلے بھر میں میری ناک کٹا ڈالی"۔

والد نے انتہائی سنجیدہ ہو کر فرمایا" ناک کٹا ڈالی! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں بھلا اس کی یہ

مجال!"

جلالؔ نے بات کاٹ کر کہا "خاں صاحب کیا عرض کروں۔" اور خاموش ہو گئے۔ والد نے بڑے ادب کے ساتھ کہا "برائے خدا جلد بتایئے اس نے کیا کیا۔ میں اسے کان پکڑ کر کھڑے کھڑے نکال دوں گا" جلالؔ صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر فرمایا "حضرت یہ جناور میرے دروازے پر آیا، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا۔ آپ خود ملاحظہ فرمایئے، لاٹھی سے میرا دروازہ ٹھونکا، اور پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا" جلال خان ہوتّ، جلال خان ہوتّ، جلال خان ہوتّ"

آپ نے سنا خاں صاحب، جلال خان ہوتّ، میں کہتا ہوں مجھے اس وقت موت کیوں نہ آگئی۔ میری دونوں بیگموں نے سُنا میرے محلے بھر نے سنا میر ضامن علی جلالؔ کو، جلال خاں ہوتّ، جلال خاں ہوتّ کے نعروں سے پکارا جاتا ہے۔

یہ کہہ کر حضرت جلالؔ نے اپنا سر پکڑ لیا اور گردن ہلا ہلا کر بار بار زیر لب کہتے رہے "جلالؔ خاں ہوتّ خاں، جلال خاں ہوتّ! اللہ اکبر، جلال خاں ہوتّ! اللہ اکبر! دیکھے آپ نے جلال کے تیور؟ یہ تھا، یادش بخیر، ہمارا لکھنؤ!۔

(۱۹۵۷ء ریڈیو پاکستان کراچی سے پڑھا گیا)

O

میر بارق لکھنوی

(یادِ رفتگاں)

اب ایک دوسرے بزرگوار کا قصہ سنیئے ۔ یہ تھے ڈبلے پتلے ، گورے چٹے ، میانہ قامت ، میر بارق لکھنوی ، جن کا سن اس وقت ستر کے لگ بھگ ہوگا ۔ لکھنؤ کے بہت سے گوشہ نشین ، لیکن خوش گو شعراء کی طرح میر بارق کی شہرت بھی کبھی لکھنؤ کی چاردیواری سے باہر نہیں نکلی میر صاحب انتہا درجے کے مفلس آدمی تھے ۔ ان کی ایک قلیل المعاش بہن ان کے محلے سے کہیں بہت دور رہتی تھیں اور وہ بے چاری کھانا پکا کر انہیں بھیجا کرتی تھیں ۔ اور کھانا چونکہ روز نہیں آسکتا تھا ۔ میر صاحب ان کی سوکھی چپاتیوں کو پانی میں تر کر کے دو دو چار وقت کھایا کرتے تھے لیکن خوداری کا یہ عالم تھا کہ وہ تقریباً روز میرے والد کے پاس آتے تھے لیکن ہمارے دسترخوان پر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے یہ بات صرف ہمیں تک محدود نہیں تھی وہ اپنے کسی قرابت دار یا کسی دوست کے ہاں کھانا کھانے کو حرام سمجھتے تھے ۔ اور جب ان سے کھانے کے اصرار کیا جاتا تو وہ بڑی صاف بیانی کے ساتھ کہتے تھے میاں اگر ہم کسی کے گھر دس بار کھانا کھائیں تو اسے ایک بار تو کھانا کھلا دیں ۔ اور جب ہماری یہ حالت ہے کہ ہم کسی کو کھانا نہیں کھلا سکتے تو پھر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم دوسروں کے گھر کھانا کھائیں اور دسترخوان کی مکھی کا خطاب پائیں ۔ ایک روز غالباً محرم کی ساتویں تھی کہ وہ ہمارے گھر آئے اس وقت مجلس کی شیرینی تقسیم ہو رہی تھی چنانچہ مٹھائی کی تھالی میر بارق کے سامنے بھی آئی ، اور انہوں نے حسبِ دستورِ قدیم اس کے چکھنے سے انکار فرمایا ۔ میرے والد نے فرمایا میر صاحب یہ تو حضرت امام حسینؑ کی نیاز کی مٹھائی ہے آپ اس تبرک سے بھی اجتناب

فرمائیں گے؟۔

یہ سن کر میر صاحب نے قائل ہو کر آنکھیں جھکالیں اور چاہتے تھے کہ برفی کی ایک ڈلی اٹھائیں کہ یکایک حامد علی خاں بیرسٹر برآمدے میں سے نمودار ہو گئے اور وہیں سے چلا کر کہنے لگے، بارق صاحب دیکھ لیا" بارق صاحب نے یہ سنتے ہی برفی کی ڈلی تھالی میں رکھ دی اور آنکھوں میں آنسو لائے۔ یہ دیکھتے ہی حامد علی خان بیرسٹر کے حواس گم ہو گئے وہ لپکے ہوئے میر صاحب کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگاری کرتے ہوئے کہنے لگے "میر صاحب اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ پر ایک ذرا سی مذاق کی بات کا اس قدر اثر ہوگا تو واللہ کہ میں ایسی جسارت کبھی نہ کرتا"۔

بارق صاحب نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا "لیکن آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ آس پاس لوگ اور سڑک والے جب "میر صاحب دیکھ لیا" میر صاحب دیکھ لیا" کا نوحہ سنیں گے تو ان کو یقین ہو جائے گا میر بارق کوئی ایسی بیہودہ حرکت ضرور کر رہا ہوگا کہ بیرسٹر صاحب کو ٹوکنا پڑا۔ آپ نے مجھے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ اب یہاں سے باہر نکل کر خلق خدا کو منہ دکھا سکوں"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ تھا ہمارے بزرگوں کا احساس بردباری اور پاس وضعداری۔ ایک شام کا ذکر ہے کہ اتفاق سے والد صاحب کے پاس اس وقت میر بارق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا کہ میرے والد نے مجھے پکارا اور میرے کان میں کہا کہ اپنی ماں سے پانچ اشرفیاں لے آؤ۔ اور رومال میں لپیٹ کر لانا چنانچہ میں رومال میں لپیٹ کر اشرفیاں لے آیا اور والد کے حوالے کر دیں ،اور والد نے مجھ سے فرمایا "اچھا جاؤ کھیلو" میں باہر چلا گیا لیکن ذوق تجسس کے باعث پاکھے کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ اب کیا ہوگا میں نے دیکھا کے والد صاحب کھڑے ہو گئے۔ اور درباریوں کی طرح جھک کر وہ اشرفیاں بارق صاحب کی خدمت میں پیش فرمائیں۔ بارق صاحب یہ دیکھتے ہی کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے "خاں صاحب بہادر حضرت عباسؑ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں یہ اشرفیاں نہیں لوں گا۔ ہرگز نہیں لوں گا اور اگر آپ دوبارہ چالیس قسم کا کرم مجھ پر کرنا چاہیں گے تو جناب امیرؑ کی قسم میں آپ کو تمام

عمر صورت نہیں دکھاؤں گا"۔ یہ تھی مردانِ خدا کی شان اور یہ تھی لکھنؤ کے بے زروں کی آن!۔

ہمت نخورد میشتر لاد نعم را

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافت کا یہ عز و افتخار ہم سے چھین لیا ہے جس کے بغیر لفظ "ایثار" بے معنی سا ہو کر رہ گیا ہے۔

ایک روز میر بارق صاحب ایک محفل میں ملے پوچھنے لگے میاں اب کس محلّے میں قیام ہے میں نے کہا "لاٹوش روڈ پر" ہے!۔ میر صاحب نے چھاتی پیٹ کر کہا "ارے تم اتنے خوش گو شاعر ہو کر ایک ایسی خبیث سڑک پر رہتے ہو جس میں (ٹ) اور (ڈ) کے سے حروف ثقیلہ پائے جاتے ہیں! میرے منہ سے تو اس نامراد سڑک کا نام تک نہیں نکل سکتا۔ اگر خاں صاحب زندہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ان حروف ثقیلہ میں کبھی قیام نہ فرماتے میاں جب تک اس محلے میں رہو گے، ہم کبھی ملنے نہیں آئیں گے۔

دیکھا آپ نے، یہ تھا ان لوگوں میں موسیقیت کا رچاؤ اور صوتی زیر و بم کا رکھ رکھاؤ!

(۱۹۵۷ء، ریڈیو پاکستان کراچی سے پڑھا گیا)

O

میرزا محمد ہادی صاحب رُسوا لکھنوی

یہ غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کی بات ہے میرے استاد میرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ نے، میرزا محمد ہادی صاحب رُسوا سے، آغائی صاحب کے دولت کدے پر میرا تعارف کرایا اور میرا کلام اُن کو سنوایا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ حضرتِ رُسوا نے میری دو تین غزلیں سننے کے بعد میرے اُستاد سے کہا تھا کہ لڑکے کے تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جس پر میرے استاد نے ارشاد فرمایا تھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں-------- تو رُسوا صاحب نے جواب دیا تھا کہ ہاتھ سے نکل جانے کا مفہوم یہ ہے کہ آگے چل کر یہ غزل ترک گوئی کردے گا-------- چنانچہ رُسوا صاحب کی پیشین گوئی صحیح نکلی اور سنِ شعور کو پہنچ کر میں نے غزل گوئی کردی اس زمانے میں حضرتِ رُسوا کا چہرہ بڑھاپے کی طرف مُڑنے ہی والا تھا، لیکن اُن کی آنکھوں میں علم و ذہانت کی وہ چمک اور اُن کے لہجے میں فطانت کا ایسا کھنکا تھا کہ میرا دل اُن کی طرف کھنچنے لگا۔

تھوڑے زمانے کے بعد اس قلبی کشش نے مجھے اُن کے بہت قریب کردیا اور میں اُن سے فارسی و عربی پڑھنے لگا۔

رُسوا صاحب کے پڑھانے کا انداز نرالا تھا، وہ پڑھاتے وقت، ایسے مزے کے ساتھ مطالب بیان کرتے تھے کہ آپ کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اس زمانے میں وہ ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ میں غالباً فلسفے کے پروفیسر تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کالج کا کوئی پروفیسر رخصت پر جاتا تھا، اس کے فرائض ان کے سپرد کردیے جاتے تھے، جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی نگاہیں تمام علوم پر حاوی تھی-------- منطق، فلسفہ، فقہ، ہیئت، نفسیات، ادب اور سائنس

زبانوں میں فارسی، عربی اور انگریزی، کون سا علم تھا جس پر ان کو دست گاہ حاصل نہیں تھی۔ آخری عمر میں ان کو موسیقی کا شوق ہو گیا تھا، اور موسیقی کو ضبطِ تحریر میں لانے کے انہوں نے علامات بھی ایجاد کئے تھے۔ جو غالباً ہزار دو ہزار کارڈوں پر مشتمل تھے افسوس کے ان کے انتقال کے بعد وہ تمام کارڈ تلف ہو گئے۔

میرزا صاحب عالم ہونے کے ساتھ ساتھ رند بھی تھے۔ شاہد و شراب اُن کی محبوب اور روز مرہ زندگی کا مشغلہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ ارباب لکھنؤ تک ان کی شاہد پرستی اور بادہ خواری کی خبر نہ جانے پائے اس لئے جب کوئی میرزا صاحب سے اُن کے مکان کا پتہ پوچھتا تھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ حضرت میرا مکان اس قدر پیچ در پیچ گلیوں میں ہے کہ آپ کو مل نہیں سکتا، کسی روز میں ضرور حاضر ہو کر اپنا مکان آپ کو دکھاؤں گا۔۔۔۔۔۔ ہر چند وہ میرے استاد تھے لیکن رعب دکھانے والے استاد نہیں تھے، وہ مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی جوانی کے رنگین واقعات کی داستانیں بیان کرتے تھے۔

میں نے ایک روز جب امراؤ جان ادا کے باب میں دریافت کیا تھا تو میرزا صاحب نے بڑے تاسف کے ساتھ یہ فرمایا تھا کہ وہ ایک غریب لیکن شریف گھرانے کی لڑکی تھی جس کو نامساعد حالات نے کوٹھے پر لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کی داستان بڑی دلچسپ بھی ہے اور بڑی دردناک بھی۔

ایک روز عالم سرخودی میں انہوں نے ایک فرانسیسی لڑکی سے اپنے معاشقے کا حال بیان کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بھی ان پر مرمٹی تھی، لیکن اس کے باپ کی موت نے اسے مجھ سے جدا کر کے میرے سر پر پہاڑ توڑ دیا تھا، جب وہ فرانس جانے لگی تو اس نے اپنی کوٹھی جو غالباً لوہے کے پل کے سامنے واقع تھی، میرے سپرد کر دی تھی اور میں اس کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا اور ہر شام کو ایک مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر پیتا اور اس کی یاد میں آنسو بہایا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عجیب و غریب واقعہ بھی بیان کیا تھا۔۔۔۔۔۔ میں ایک روز سرِ شام مولسری کے نیچے پی پی کر رو رہا تھا کہ ایک سواری آ کر عین میرے سامنے رک گئی۔ اس سواری سے ایک

نہائیت پری جمال وکم سن عورت نکلی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور چھوٹتے ہی کہنے لگی میرزا صاحب کسی جا کر نہ آنے والے کے انتظار میں اس طرح عمر برباد نہ کرنا چاہئے آپ کیوں زندگی برباد کر رہے ہیں۔ اس کی یہ بات سن کر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ ابھی میں کچھ بول بھی نہیں سکا تھا کہ اس پری جمال نے بڑی شوخی کے ساتھ مجھ سے کہا، میرزا صاحب میری سواری کا کرایہ تو دیجئے میں حیران ہو کر اُٹھا کہ اندر جا کر کرایہ لے آؤں۔ میرے اٹھتے ہی اس نے کہا، دیکھیے، آپ کے جس پیلے بکس میں چھ سو روپے رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں سے میری سواری کا کرایہ نہ نکالیے گا۔ یہ سنتے ہی اس کے حسن وجمال نے جو کچھ میرے دل میں پیدا کر دیا تھا، اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، آپ کون ہیں، اس نے قہقہہ مار کر کہا، آپ کرایہ دینا نہیں چاہتے، یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، ایک طرارہ بھر کر اپنی سواری میں بیٹھ گئی۔ کوچ بان نے تڑسے گھوڑے کی پشت پر کوڑا مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سواری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں پسینے میں نہا گیا۔ موڑھی کے نیچے سے اٹھا۔ کمرے میں گیا، اندر سے چٹخنی لگائی اور منہ ڈھانک کر لیٹ گیا۔ لہو بہت دیر تک کانپتا رہا اور آج تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ وہ عورت کون تھی اور اس کو میرے پیلے بکس اور اس میں رکھے ہوئے روپے کی پوری تعداد کیوں کر معلوم ہو گئی تھی۔

ایک روز میں اُن کے گولہ گنج والے مکان میں گیا۔ اوپر جا کر دیکھا کہ وہ فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے گرد کتابوں کا ایک انبار ہے اور وہ اس قدر اونچا ہے کہ صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ استاد یہ کتابیں کیسی ہیں جو آپ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ احادیث وتفاسیر کی کتابیں ہیں

لکھنؤ میں ایک سیاہ فام، بے ٹھڈی کے شاعر تھے کلیم، جن کو اہل لکھنؤ کجری بن کا ہاتھی کہا کرتے تھے۔ کلیم صاحب نہائیت بد دماغ اور لڑاکو آدمی تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر آستینیں چڑھا لیا کرتے تھے۔ جب "کلام کلیم" کے نام سے ان کا دیوان شائع ہوا تو میرزا صاحب نے کسی کو بھیج کر ان کے دس بارہ دیوان خرید لئے۔ محلّے کے ایک کبڑیے کو بلایا۔ کلام کلیم کو پھاڑ کر اس کے حوالے

کیا۔ اور تمام باتیں سمجھا بجھا کر اس کو حکم دیا کہ سہ پہر کو چوک جانا اور حیدر حسین خان کے پھاٹک کے نیچے، میں نے جس طرح بتایا ہے، اسی طرح نعرے لگانا شروع کر دینا۔

میرزا صاحب، میں، اور دس پندرہ دیگر واقفانِ راز وقتِ مقررہ سے کچھ پیش تر ہی خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی دکان میں جو حیدر حسین خان صاحب کے پھاٹک کے تقریباً سامنے تھی جا کر بیٹھ رہے۔

کلیم صاحب چوک ہی کی گلی میں رہتے، اور بڑی پابندی کے ساتھ، ٹھیک چار بجے حیدر حسین خان کے پھاٹک سے نکل کر چوک میں اِدھر اُدھر ٹہلتے اور نگارانِ سر بام پر نگاہیں دوڑایا کرتے تھے------- جب گھڑی نے بتایا کہ چار بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے ہیں تو ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے کہا آج تو میرزا صاحب آپ لوگ ایسے نظر آ رہے ہیں گویا کسی جلوس کا انتظار ہو رہا ہے۔ میری ہنسی نکل گئی۔ میرزا صاحب نے آنکھ مار کر مجھے روک دیا--------- لیجئے چار بج گئے--------- سیاہ فام کلیم صاحب، حیدر حسین خان کی پھاٹک میں نظر آئے۔ کبڑیے نے انہیں دیکھتے ہی نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ گوبھی ٦ پیسے سیر، آلو ٨ پیسے سیر، کلام کلیم ٢ پیسے سیر کلیم صاحب نے گھبرا کر دیکھا۔ اور کہا ابے کیا بک رہا ہے؟ کبڑیے نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ گویا اسے کلیم صاحب کے وجود کی خبر ہی نہیں تھی۔ اور دوبارہ نعرہ لگایا۔ گوبھی ٦ پیسے سیر، آلو ٨ پیسے سیر، کلام کلیم ٢ پیسے سیر، کبڑیا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اب کلیم صاحب کیا کرتے، چیخ چیخ کر کہنے لگے یہ اس دو کوڑی کے کبڑیے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کن مردودوں کی حرکت ہے۔ ایک ایک سے سمجھ لوں گا سالے ہمارے لکھنؤ کی تہذیب کو بدنام کرنے والے مجھ سے بچ کر کہاں جائیں گے-----------

-------------☆-------------

ایک مرتبہ حیدرآباد سے رخصت لے کر وہ لکھنؤ گئے۔ وہاں سے آئے تو کپڑے بدلے بغیر دفتر چلے گئے۔ میں نے کہا میرزا صاحب میلے کپڑے پہنے چلے آئے۔ آپ دفتر میں، انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

اب تک رخِ سفر نہ بدلا
دامن پہ غبارِ لکھنؤ ہے

میرزا صاحب کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اگر اتنے بہت سے علوم کی جانب راغب نہ ہو کر وہ صرف کسی ایک علم کو اپنا لیتے تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کے عظیم انسانوں میں سے ایک ہوتے اور تاریخ اُن کے ماتھے پر۔ شہرتِ دوام کا تاج رکھ دیتی۔ افسوس کہ انہوں نے اپنے قوائے ذہنی کو اس قدر علوم کے میدان میں پھیلا دیا کہ وہ جس مرتبے کے مستحق تھے وہ اُن کو حاصل نہ ہو سکا۔ میرا ایک بہت پرانا مطلع اُن پر کس قدر صادق آتا ہے۔

اے جوشؔ فراقِ جاناں میں، فریاد و فغاں سے کام نہ لے
گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر اجزائے تپش تقسیم نہ کر

اب آخر میں میرزا صاحب کے دو چار شعر سنا کر اس گھبراہٹ کے لکھے ہوئے سرسری مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

کل اُن کو آتے آتے جو کچھ دیر ہو گئی
دُنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

دل میں چھپی تھی گو کہ ------ خواہشِ گناہ

میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو ----------

لکھنؤ میں مشاعرہ ہوا تھا، طرح تھی۔

کوئی پرساں ہی نہیں ہے عاشقِ دلگیر کا

میرزا صاحب کا اس طرح میں ایک شعر سنئے اور دیکھئے مصرعِ ثانی پر کس دقتِ نظر سے مصرعِ اوّل لگایا ہے، فرماتے ہیں۔

وضع کے پابند ہم اور عاشقی جدت پسند
پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

آپ نے ملاحظہ فرمایا "وضع کی پابندی اور جدت پسندی میں کیسا اثر پیدا کر دیا ہے، ایک معیار" کے مشاعرے میں میرزا غالب کی طرح دی گئی تھی۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ذرا ماہر ے میرزا صاحب کا بھی اس طرح میں شعر سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

وہ جو کچھ باتیں کہ ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اَب سُنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

اب نہ وہ میرزا صاحب ہیں، نہ وہ لکھنؤ ہے، نہ وہ لوگ۔ رہے نام اللہ کا۔

O

بُلبُلِ پاکستان، ڈاکٹر عالیہ امام

ڈاکٹر عالیہ امام، ماشاءاللہ، قبول صورت بھی ہیں، اور قبول سیرت بھی ان کے والد محترم سید عسکری صاحب، میرے بے حد محبوب دوست، اور نہایت سخن سنج انسان تھے۔ اُن کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ میر انیس کا تمام کلام، اُن کے ذہن میں اس قدر مستحضر تھا کہ، جس مقام سے بھی فرمائش کر دیجئے، وہیں سے وہ سنانے لگتے تھے، اور پڑھنے کے انداز کا یہ عالم تھا کہ چشم وابرو سے، معانی کی تصویر بن جایا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ، موسیقی پر اُن کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ جب بھی، عالم سرخوشی میں، وہ ٹھمریاں اور دادرے گانے لگتے تھے، تو میرے عنفوانِ شباب کا لکھنؤ، آنکھوں کے نیچے پھرنے لگتا تھا۔ ہائے کہاں ہیں اب ایسے لوگ۔

وے صورتیں الٰہی ، کس دیس، بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو، آنکھیں ترستیاں ہیں

عالیہ بی بی نے اپنے باپ کی ذکاوت وذہانت ورثے میں پائی ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش وہ سیاست میں بھی گہری نظر رکھتی ہیں اور اسی ذوقِ سیاست کی وجہ سے وہ چین وروس کا بھی دورہ کر آئی ہیں۔

ان کی سب سے بڑی دولت، ان کی خطابت ہے اور سروجنی نائیڈو کے بعد، اگر کہیں نظر پڑتی ہے تو ان کے انداز خطابت پر، وہ جب بولتی ہیں تو ان کا لب ولہجہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

ان میں خوش مزاجی کا جوہر بھی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ باتیں کرنے پر آتی ہیں تو کھلکتے قہقہے برساتی ہیں، اور قہقہوں سے شہد کی بوندیں ٹپکاتی ہیں۔ ان کے مزاج کی یہ خصوصیت بھی نہایت قابلِ قدر ہے کہ جب وہ کوئی شاعرانہ بات سنتی ہیں، اس کو لکھ کر، محفوظ کر لیتی ہیں ان کو

ہر ذہین مرد اور عورت کی طرح اُمورِ خانہ داری سے کوئی دور کا بھی شغف نہیں ہے، اور اس لئے ان کے شوہر میاں کا قلم امام کا منہ پھولا رہتا ہے۔

وہ مستقل مزاجی اور تلوّن، دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے، نامساعد حالات کے باوجود ایم اے کر کے، پی ایچ ڈی کی سند، بڑے استقلال کے ساتھ، حاصل کر لی، اور دوسری طرف تلوّن کا یہ عالم ہے کہ روز نئی نئی ادبی اسکیمیں بناتی ہیں۔ اور نئی نئی انجمنوں کی طرح ڈالتی رہتی ہیں۔ مگر کسی کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچاتیں۔ یعنی وہ قطب بھی ہیں اور بادِ صبا بھی اور یہی مجموعیت ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔ ان کو، میں نے تقریر کی شاہ زادی کہا تھا اور اب بلبلِ پاکستان کا خطاب دیتا ہوں۔

جوشؔ

۲۳۔۲۔۷۳

O

سیّد محمد عسکری

یہ دیکھئے میرے پرانے دوست عسکری صاحب ہیں-------یادش بخیر، آج سے تقریباً تیس برس پہلے جب میں پہلی بار اُن سے بھوپال میں ملا تھا، وہ ایک کامیاب ایڈووکیٹ اور ایک خوش رو جوان تھے، رنگ ان کا سرخ و سفید تھا، مونچھیں بڑی بڑی، رعب آفریں و جمال انگیز تھیں۔

عسکری صاحب، موسیقی کے قدرداں اور میر انیس کے پرستاروں میں سے ہیں، حافظے کا یہ عالم ہے کہ میر صاحب کے تمام مرثیے ان کے حافظے میں محفوظ ہیں، اور جس مرثیے کے جس مقام کی فرمائش کیجئے، وہ اسی مقام سے، بے تکلف سنانے لگتے ہیں اور رات کو جب سرخوشی کی موج میں آتے ہیں تو ایسی ایسی ٹھمریاں اور ایسے ایسے دادرے، لہک لہک کر سناتے ہیں کہ تمام فضا رقص کرنے لگتی ہے۔ بیتے ہوئے جشن ہائے رامش و رنگ سامنے آ آ کر سر پیٹنے اور آنسو بہانے لگتے ہیں، اور فضا سے آواز آنے لگتی ہے۔

ہائے جوانی، ہائے زمانے

ان کی بیگم کے انتقال نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ کچھ تو اس بے پناہ غم اور کچھ ماہ و سال کے نقوش قدم نے ان کے چہرے اور ان کے دل، دونوں کو بجھا کر رکھ دیا ہے، چہرے کی آب و تاب اڑ چکی ہے، حسین مونچھیں منڈ چکی ہیں، چلنے پھرنے کا دم نہیں رہا ہے اور آنکھیں جواب دینے کے قریب ہیں۔ صد حیف! روزگار کے ستم پر جس نے ایک خوب رو، انسان کو یوں گم سُم اور نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔

گذشتہ سال جب عسکری صاحب کراچی آئے اور اپنی قابل ناز بیٹی ڈاکٹر عالیہ کے وہاں

ٹھہرے ہوئے تھے، میں اُن سے ملنے گیا تھا، فریقین نے جب ایک دوسرے کو اس قدر بوڑھا دیکھا تو دونوں کی آنکھیں بھر آئیں میری جگر جگر صورت اُن کی آنکھوں اور اُن کی جگمگاتی صورت میری آنکھوں میں پھرنے لگی ------------ ہائے وہ عالم، جب دو جوانی کے عالم میں جدا ہونے والے، بڑھاپے کے دور میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اب دو ایک چھوٹے موٹے لطیفے بھی سُن لیجے۔

جاں نثار اختر، نے ترقی پسندوں کا ایک مشاعرہ بھوپال میں کیا تھا۔ اور اس مشاعرے میں مجھ کو پکڑنے کے واسطے انہوں نے عسکری صاحب کو میرے پاس لکھنؤ بھیجا تھا۔ عسکری صاحب سے میں نے وعدہ کر لیا کہ کل صبح کی گاڑی سے ان کے ہم راہ چلوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ میں اُن کے ساتھ چار باغ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹکٹ خرید لئے گئے، ہم دونوں اپنے درجے میں جا کر بیٹھ گئے، لیکن ایک آن میں میرا موڈ بدل گیا، دل سے آواز آئی "جوش بھاگ کھڑا ہو" یہ کیفیت پیدا ہوتے ہی میں ریل کی آخری سیٹی کا انتظار کرنے لگا۔ اور جیسے ہی آخری سیٹی کے ساتھ ریل حرکت میں آئی۔ میں دروازہ کھول کر کود پڑا، لیکن اس طرح داری کے ساتھ کہ عسکری صاحب کو اس سانحے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

عسکری صاحب کو تھوڑی ہی دیر میں پتا چل گیا کہ میں غائب ہو گیا ہوں، لیکن ڈاک گاڑی تھی، بیچ میں وہ کہیں اتر ہی نہیں سکے، جب کانپور اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو اترے، انجن سے گارڈ کے درجے تک مجھے تلاش کیا اور جب میں نہیں ملا تو کان پورسے، دوسری گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے لکھنؤ آئے اور میرا سامنا ہوتے ہی مجھ پر برس پڑے، اور گرفتار کر کے کان پور لے گئے۔

ایک بار میں حیدر آباد دکن سے لکھنؤ جا رہا تھا، عسکری صاحب کو تار دے دیا کہ بھوپال اسٹیشن پر مل جائیں۔ وہ پلیٹ فارم پر ملے، ہم آغوش ہوئے، مجھ سے وعدہ لیا کہ واپسی میں دو روز کے واسطے بھوپال میں ضرور قیام کروں گا۔ اتنے میں گاڑی رینگنے لگی، میں نے کہا "پیارے کیا میرے ساتھ لکھنؤ نہیں چلو گے، انہوں نے کہا کہ ضرور چلوں گا اور جھپٹ کر میرے ڈبے میں آ گئے، نہ کپڑے ساتھ تھے، نہ بستر لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی، اور شام ہوتے ہی ایسی ایسی ٹھمریاں سُناتا

شروع کر دیں کہ میرے تمام رفقائے سفر جھومنے لگے۔

ایک بار جب کہ میں بمبئی میں رہتا تھا، دیکھتا کیا ہوں کہ عسکری صاحب پریشان صورت بنائے میرے سامنے کھڑے ہیں، اُن کے چہرے کی وحشت دیکھ کر میں معانقہ بھول گیا۔ اور پوچھنے لگا معاملہ کیا ہے، کہنے لگے میرا بیٹا کمونسٹ ہو گیا تھا، اس لئے آیا ہوں کہ اس کو پکڑ کو بھوپال لے جاؤں، میں نے زور سے قہقہہ لگایا تو بگڑ گئے "کیوں صاحب آپ میری مصیبت پر قہقہے مارتے ہیں" میں نے کہا جی ہاں، کیوں نہ قہقہے ماروں، آپ کے لڑکے کو صراطِ مستقیم مل گیا ہے اور آپ آئے ہیں اُس کو گم راہ کرنے۔ ابوجہل کا بیٹا اگر مسلمان ہو جاتا تو اس کو بھی ایسا ہی غصہ آتا۔ میری باتیں سن کر عسکری صاحب ہنسنے لگے، اور پھر سنجیدہ ہو کر انہوں نے کہا میں بھی اشتراکیت کو پسند کرتا ہوں، لیکن ہر تحریک کے آغاز میں لوگوں کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں، میرا بیٹا قربانی کا بکرا کیوں بنے، جب اشتراکیت کو فتح حاصل ہو جائے اُس وقت وہ اس میں شامل ہو جائے۔

میں نے کہا، کیوں صاحب آپ کا پُوت تو پوت ہے، اور دوسروں کے پُوت پنگھوڑے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ قہقہے مار کر مجھ سے لپٹ گئے اور گانے لگے۔

اندھریا ہے رات، سجن جھتو کے رہیو
اری اندھریا ہے رات

جوشؔ

کراچی ---------- ۲۱-۲-۶۵

○

رُباعی کے متعلق

رُباعی، ایک بہت بڑی بلا، اور نہایت جان لیوا صنفِ کلام ہے یہ کم بخت چالیس برس سے پیش تر کسی بڑے سے بڑے شاعر کے بس میں آنے والی چیز نہیں۔

بات یہ ہے کہ جب تک کسی شاعر کو بے پناہ مشاقی اور بے نہایت دیدہ وری کی بدولت، دریا کو کوزے میں بھر لینے کا کام نہیں آتا، اس وقت تک رباعی اس کے قابو میں نہیں آتی۔

قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے صرف چار مصرعوں میں اس ربع مسکوں کے تمام تجربات تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا، ایک ننھے سے قطرے میں قلزم کو مقید کر لینا، ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں--------- اس لئے کہ۔

تا صد ہزار خار نمی روید از زمیں
از گُل بنے، گُلے، بگلستاں نہ می رسد

میں نے رباعی کہنے کا آغاز، یادش بخیر، حیدر آباد میں کیا تھا، اس وقت میری عمر سن بعثت، یعنی چالیس ویں سال تک نہیں پہنچی تھی وہاں میں نے تقریباً چار پان سو رباعیاں کہی تھی۔ جن میں رومان و رندی زیادہ اور فکر بہت کم تھی۔ اب ان رباعیوں میں سے ایک مصرع بھی میرے پاس نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ تلف یا چوری ہو گئیں۔

البتہ اس زندگی کے دورِ آخر میں کچھ اوپر تین سو رباعیاں بڑی قطع و برید کے بعد میں نے صاف کیں تھیں ان کے چوری ہو جانے کا مجھے بہت قلق ہے۔ میرے جن رفیقِ دیرینہ نے وہ رباعیاں اڑائی ہیں، میں ان کے نام سے بخوبی واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ انہوں نے ازراہِ قدر دانی میری وہ رُباعیاں اس توقع میں اڑائی ہیں کہ میرے مرجانے کے بعد وہ انہیں بڑی

قیمت پر فروخت کریں گے۔ میری دعا ہے کہ خدا نہ کرے کہیں وہ میرے سامنے نہ مر جائیں اور اپنی آرزو پوری نہ کر سکیں۔ مجھے اپنی عمر کی شرافت سے یقین ہے کہ وہ بہت جلد ختم ہو کر میرے رفیقِ جانی کو شادکامی کو موقع دے گی۔

ایں دُعا از من و از اہلِ جہاں آمین باد!

بہر حال میری یہ غیر مطبوعہ تازہ رباعیاں جو اس پاکٹ ایڈیشن میں طبع ہو رہی ہیں[1] میری زندگی کا تقریباً نچوڑ ہیں-------- لیکن ادبی دیانت کے ساتھ یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مشاغلِ وفکر وہات کے زہرہ گداز ہجوم کی بناء پر میں اب تک ان پر نظرِ ثانی نہیں کر سکا ہوں۔ اگر نقادانِ سخن کو ان میں کچھ نقائص نظر آئیں تو ان کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ مجھے ان سے ضرور مطلع فرمائیں۔

لیکن، اسی کے دوش بدوش، یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ روئے سخن یوپی کے نقادوں کی طرف نہیں ہے اس لئے کہ یہ یگانہ کش صوبہ عظیم اپنے ہر "باروچی ٹولے" میں ایسے بے شمار طفلان کام کو جگہ دیئے ہوئے ہے جو اپنے کو "نعمت خان عالی" کا اُستاد سمجھتے ہیں اور اپنے اہلِ وطن پر کیچڑ اُچھالنے کو اپنا آبائی و دینی فریضہ خیال فرماتے ہیں۔

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی![1]

(۲۳-۶-۵، دہلی شریف)

---

[1] قطرہ و قلزم۔ ناشر ستار پبلی کیشنز، دریا گنج دہلی ۶------ ۱۹۶۳ء

چند سطریں

○------ دل وہ آئینہ ہے کہ کبھی گھن سے نہیں ٹوٹتا اور کبھی موجِ صبا سے چور چور ہو جاتا ہے۔

○------ تھالی کبھی کوٹھے سے گرتی ہے اور جھنکار نہیں ہوتی اور کبھی گرتی ہی نہیں اور جھنکار پیدا کر دیتی ہے (کبھی گرنے سے نہیں جھنکارتی، کبھی رکھے رکھے جھنکارنے لگتی ہے)

○------ کبھی آئینہ پتھر کے فرش پر گرتا ہے اور نہیں ٹوٹتا اور کبھی زانو پر رکھے رکھے تڑک جاتا ہے۔

○------ آنکھیں پھول دیکھتی ہیں، اور دل میں کانٹا پیوست ہو جاتا ہے، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

○------ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، اس کو دل میں بو دیتی ہیں، اور جو کچھ دنوں کے بعد یادوں کے خاردار پودے نکل آتے ہیں (بوئے جاتے ہیں ہلال، کاٹے جاتے ہیں خنجر)

صبح ------ ۵ بج کر ایک منٹ

۵ جنوری ۱۹۶۳ء کراچی

○

اَجزا و عناصر

مُتعلقاتِ بشریٰ

جسم ------- سینہ، شکم، دست، پنجہ، گوش، زبان، انگشت، بینی، چہرہ، عارض، لب، اَبرو، جلد، سُر، گلو، کمر، ساعد، بازو، پیشانی، ذقن، دندان، دہن، سُرین، کیر، اندامِ نہانی، کون، خصیہ، ناخن، پشت، سر، پستان، پہلو، شانہ، پُشت، اعصاب، استخواں، گوشت، خون، ناف، مفاصل، ناخن، بغل، گردن، مغز، استخواں، عرق، خال وخد، لون، ریش، بروت، مسامات کفِ دست، پشتِ دست، کفِ پا، پُشت پا، دل، جگر، معدہ، رگ جاں، گردہ، مثانہ، دماغ، زیرِ ناف، ران، چندیا، گدّی، کہنی، کولا، کلائی، گدّی، مکا، پور، ریڑھ، گھٹنا، گہنی، پسلیاں، تلوا، گھائی، ہتھیلی، پھیپھڑے، تلی، ملا، پنڈلی۔

حواسِ خمسہ

باصرہ، بینائی، نظر، نگاہ، نگہ، بصارت، چشم، دیدۂ نرگس، مژگاں، مژہ، پلک، مردمکِ چشم، پردۂ چشم، حلقۂ چشم، چشمکِ نظارہ، تماشا، منظر، نظرگاہ، تماشا گاہ، بے بصر، بابصر، جہاں بیں، خوش نظر، خوش نگاہ، خوش نگہ، جہاں تماشا، خوش مژگاں، دراز مژگاں، نرگس ناز، چشمِ حق نگر، دیدہ ودل بینا، خاطرِ بینا، چشم نگراں، خاطرِ نگراں، (خاطر مشوش خاطر چشم براہ)، عالم دیدہ، دیدہ افروز، فلک ناظر (دیکھنے اور انتظار کرنے والا) نظاری، Sight (دیکھنا، تماشا) نظارگی،

۳۰/۵/۶۲

آخری زمانے کی ایک تحریر

یاں چھپتی دھوپ ہے گلابی سایا
رہتا ہے سحابِ ابدیت چھایا
جوش آؤ کے منتظر ہے بزمِ ارواح
آیا، یارانِ رفتہ، آیا آیا

رات کے پچھلے پہر احساسات کی دنیا میں جب ڈوبنے لگتا ہوں تو اپنے یارانِ رفتہ کی "آواز" سُن کر میرے احساس کی دنیا ہل جاتی ہے۔ دل تڑپ کر کہتا ہے کہ "اے جوش اٹھ اور لبیک لبیک کہتا ہوا مرحوم ساتھیوں سے جا مل" ۔۔۔۔۔ مگر اف یہ مرحلۂ جبر و اختیار ۔۔۔۔ انسان کس قدر مجبور ہے کہ اپنے بچھڑے ہوئے احباب سے ملنے کے لیے خود موت کی دہلیز پار بھی نہیں کر سکتا (خودکشی میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے) بقول مرزا عالمگیر قدر مرحوم، اللہ میاں نے محترم عزرائیل صاحب کو یہ اختیار سونپ دیا ہے کہ بسترِ مرگ پر انسان چاہے سسکتا رہے لیکن تمنائے بشر کے مطابق نہیں بلکہ منشائے ایزدی کے مطابق اس کی روح قبض کرے۔ لیکن شاید اللہ میاں نے حضرتِ عزرائیل کو میرے گھر نہ آنے کے مستقل احکامات دیدیے ہیں تاکہ جوش سسکتا رہے تڑپتا رہے اور موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہے اسپتال بھی رہ کر آ گیا لیکن اُس پابندِ حکمِ الٰہی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اب تنہائی کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ جو لوگ میرا دم بھرتے تھے اور اپنی جان مجھ پر چھڑکنے کے دعوے کرتے تھے اب ملنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے شاید انہیں اب یقین ہو چلا ہے کہ یہ پوپلے منہ والا نحیف، کمزور، لاغر اور بوڑھا انسان اب ان کے کسی کام کا نہیں۔ تُف ہے اس حرام زادی دنیا کے ایسے حرام زادے ریاکاروں پر ۔۔۔۔۔

ہاں۔ مبارک باد کے لائق ہیں میاں ہلال نقوی کہ وہ اس عیار اور مصلحت پسند دنیا میں رہ کر بھی اپنی دیرینہ محبت کا بھرم قائم کیے ہوئے ہیں کراچی سے طویل مسافت طے کرتے ہوئے اور سفر کی مشکلات اٹھاتے ہوئے وہ اپنی بیوی اور بچے کے ہمراہ یہاں مجھ سے ملنے آئے ہیں انھیں دیکھ کر حیران ہوں اور خوش بھی۔۔۔۔۔۔آج میاں ہلال نقوی نے مقالے کے اقتباسات بھی سنائے اور ذوقؔ کے دو نادر و نایاب مرثیوں کے قلمی نسخے بھی دکھائے، اس دھان پان نوجوان نے اپنی قوتِ تخلیق کے مضبوط ہاتھوں سے زمینِ ادب کے سینے پر صدیوں کی جمی ہوئی گرد کی تہوں کو اس طرح کھرچ دیا ہے کہ تہذیب و فن کے گم شدہ خزانے اپنی جھلکیاں دکھانے لگے ہیں۔

میاں ہلال نقوی سے میں پہلی بار اس وقت واقف ہوا جب غالباً پندرہ برس قبل وہ مجتبیٰ[1] کے ساتھ میرے گھر آئے تھے اس وقت اُن کی عمر پندرہ سولہ برس کی ہوگی کم عمری ہی سے اُن کے مزاج میں سخن فہمی، ادب دوستی، بیباکی اور جراُتِ حق کی جو روح دوڑ رہی تھی اُس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میرے کراچی کے زمانۂ قیام میں وہ تقریباً روز مجھ سے ملنے آتے اور میرے نواسے کو بلا معاوضہ، اردو پڑھاتے اُسی زمانے میں ان کے دل و دماغ پر صحیفۂ شاعری نازل ہوا اور وہ مجھ سے اصلاح لینے لگے۔

میاں ہلال نقوی کی طبیعت میں زود گوئی کا ملکہ بہت ہے اسی وجہ سے طویل نظم کہنے میں انھیں بڑی دسترس ہے اور اس میدان میں وہ نئی نسل کے شعرا کے ہیرو کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے اب آزاد نظم کو بھی اپنا لیا ہے یہ ان کے فنِ شعر کی کمزوری کی دلیل ہے۔ آزاد نظم ان تساہل پسند ضعیف اذہان کی پیداوار ہے جنھیں الفاظ کے صرف پر قدرتِ کامل نہیں ہے اور جو وزن و بحر کے کوزے میں تجربات و احساسات کے سمندر کو سمیٹ لینے کا جوہر نہیں رکھتے۔

میاں ہلال نقوی میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ تجربات و احساسات کی بھٹی میں اپنے دل و دماغ کو اس قدر تپالیں کہ اُن کے حرف حرف سے آفتابِ فن طلوع ہونے لگیں۔

۲۷۔۶۔۸۱ اسلام آباد

[1] پروفیسر مجتبیٰ حسین (صدر شعبۂ اُردو، جامعہ بلوچستان)

باباذہین شاہ تاجی

کوئی تک بھی سے جناب والا نجم رہبرِ خراباتی اور حضرت ذہین شاہ تاجی کے مابین ارتباط و اختلاط کا ــــ وہ غیب ہیں، میں شہود، وہ ذکر ہیں، میں فکر، وہ معتقد ''الہام'' ہیں میں منکرِ پیغام، وہ وُرود، میں عود، وہ حرم، میں بیت الصنم، وہ مخوتالۂ صباحی، میں غرقِ دجلۂ صُراحی؛ وہ گریہ شبانۂ میں خندۂ سحر گاہانہ، وہ نقیبِ لا الا''، میں خطیبِ منبرِ گناہ ــــ وہ یقین کی گلی میں، بڑے اطمینان کے ساتھ دھونی رمائے، بیٹھے ہیں، میں تشکک کی وادیوں میں، یہ کہتا ہوا، خاک چھان رہا ہوں کہ:۔

صبا، بلطف بگو آن غزالِ رعنا کا
کہ سر، بکوہ و بیاباں تو دادیٔ مارا:

اُن کی آنکھوں میں رازیابی کا سُرور ہے، میرے دل میں تجسس کا ناسور ہے، ان کو اپنے علم کا احساس ہے، میں اپنے جہل کا مُعترف اور رو رہا ہوں کہ:۔ ایں ہا، ہمہ راز ست کہ معلومِ عوام ست۔ وہ گردن جھکاتے ہیں اور ''جلوۂ یار'' کو سامنے پاتے ہیں، میں، ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں کہ:۔

ساقی مطرب دے، جملہ مہیات دے
کیف بے یار میسّر نہ شود، یار کجا ست؟

وہ جب صبح کے گلابی نور میں آنکھیں اُٹھاتے ہیں، تو ''شاہدِ غیب'' کے جلوؤں کے پھولوں سے ان کی نظر کا دامن بھر جاتا ہے اور:۔ ''گل چینِ بہارِ تو، ز داماں گلہ دارد'' کے ترانے چھڑ جاتے ہیں، اور میں نامُراد جب منہ اندھیرے جاگتا ہوں تو یہ شعر بے ساختہ زبان پر جاری ہو جاتا ہے:۔

شب تار است و رہ وادیٔ ایمن در پیش،
آتش طور، کجا، وعدۂ دیدار کجاست؟

اور جب، گریزپا ستاروں پر نظر جماتا ہوں تو، گریباں پھاڑ کر چلاتا ہوں:۔

اے، رات گئے کے غم گسارو، بولو
اے عالمِ بالا کے اشارو، بولو
اس پردۂ رنگ و بُو میں پوشیدہ ہے کون؟
بولو، اے ڈوبتے ستارو، بولو

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مجھ میں اور ذہین شاہ میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے؟ اسی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ شاہ صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ نفسِ کُلّی اور حقائقِ کائنات کا ادراک، وجدان، اور فقط وجدان سے حاصل ہو سکتا ہے، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وجدان ایک ایسی طاقت ہے، جو فقط فنونِ لطیفہ کی تخلیق و تزئین کے کام آتی ہے، تفتیش و تحقیق اس کا وظیفہ ہی نہیں۔ وہ ایک مقیش کا پھندا ہے۔ جس سے میدانِ جستجو، میں پھاوڑے کا کام لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس بناء پر میرا ایمان ہے کہ یہ صرف تفکّر و تدبّر ہے، جس کی چٹکی، لیلائے کائنات کے مکھڑے سے نقاب اُٹھا سکتی ہے۔

شاہ صاحب کا تصوف، ذرّوں میں بھی موتی دیکھ لیتا ہے، اور میری فکر سچے موتیوں پر بھی نگاہ جماتی ہے تو وہ آنسوؤں میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہم نے پھولوں کو چھوا، پل بھر میں، کانٹے بن گئے
اس نے، کانٹوں پر قدم رکھا، گلستاں کر دیا

وہ "آہ" کے شیدائی ہیں، میں "نگاہ" کا ___ اُن کا نعرہ ہے:۔

دُعائے صبح و آہِ شب، کلیدِ گنجِ مقصود است
بایں راہ و روش می رَو کہ بادل دار پیوندی

اور میں پکار پکار کر کہتا ہوں:۔

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست

اُن کے اشراقی گنبد میں: "اَلسّلام، اے عشقِ خود سودائے ما" کے ترانے چھڑے ہوئے ہیں اور میری کارگاہِ تاثل سے "اَلسّلام، اے عقلِ خوش ملجائے ما" کی آوازیں آ رہی ہیں، وہ دل میں تجلیات کا مُشاہدہ کر کے فرماتے ہیں ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد۔" اور میں خم خانۂ ادراک میں گنگنا رہا ہوں کہ:۔

"ما در پیالہ، عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم"

وہ تصوف کی سُہانی چاندنی میں مقاماتِ معنوی کا درس دے رہے ہیں، اور میں تجسس کی کڑی دھوپ میں کھڑا آواز دے رہا ہوں۔

مصلحت نیست کی از پردہ بُرون افتد راز
ورنہ، در مجلسِ رندان، خَبرے نیست کہ نیست

ان دست و گریبان و متضاد حالات میں، ہمارے درمیان، آویزش کے بجائے، ارتباط و اختلاط کا پیدا ہونا، اور اس کا تھوڑے ہی دن کے بعد، شدید محبت میں تبدیل ہو جانا ایک عجیب معجزہ ہے معلوم ہوتا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا، قدِ یار کا عالم
میں، معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

ارباب نظر ہماری محبت کو دیکھتے ہیں تو بھونچکا سے ہو کر رہ جاتے ہیں، اور، گھبرا گھبرا کر، ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، صاحبو، خدا را بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے، کوئی اللہ کا بندہ کچھ تو روشنی ڈالے اس خرقِ عادت پر کہ خانقاہ و خرابات کے ڈانڈے کیسے مل گئے، قلقلِ مینا اور نعرۂ "یاہو" میں کن بُنیادوں پر سمجھوتا ہو گیا، اور کاشیِ بادہ کعبۂ سجادہ نے، ایک دوسرے کی گردن میں بانہیں کیوں کر ڈال دیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

اب تو یہ عالم ہے کہ ہم دونوں یعنی شاہ صاحب اور شاعر صاحب ایک دوسرے کی محبت میں بھی پڑ گئے ہیں، ایک طرف تو میرے برادرانِ فکر، تیوری چڑھا چڑھا کر مجھ کو طعن و تشنیع کا ہدف بنائے ہوئے ہیں، اور ان کی ناکیں لانبی ہو ہو کر مجھ سے کہہ رہی ہیں کدھر چلے پیر و مرشد، کیا اپنی عقل کے ساتھ ساتھ، ہم سب کا بیڑا بھی غرق کر دینے پر کمر باندھ لی ہے، اور سب کی آنکھیں، ایک دوسرے کی طرف اُٹھ اُٹھ کر، یوں پوچھ رہی ہیں۔

چیست، یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

اور دوسری طرف، حضرت کے صاحب ذکر معتقدین میں کھلبلی سی مچی ہوئی ہے، وہ مٹھیوں میں اپنی اپنی داڑھیاں پکڑ پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ اُن کے آقا و مولیٰ کو آخر ہو کیا گیا ہے کہ جوش کے سے بدعقیدہ و بے یقین ملحد کر اپنی مسند پر بٹھاتے اور کلیجے سے لگاتے ہیں۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم دونوں، ایک دوسرے سے گا گا کہ یہ کہہ رہے ہیں:۔

''میں تو ہو گئی بدنام، سنوریا تورے لئے''!

بات یہ ہے کہ میرے احباب اور حضرت کے معتقدین کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے کیوں ہیں۔ ہم پر تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ:۔

ہر کسے، از ظنِ خود ، شد یارِ مَن
وز درونِ مَن ، نجست اسرارِ مَن

اُن بے چاروں کا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور میرے مابین جو محبت پائی جاتی ہے وہ اس امر پر مبنی ہے کہ شاہ صاحب کے عشق نے، میری عقل کے سامنے، یا، میری عقل نے اُن کے عشق کے آگے سپر ڈال دی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ:۔

تم ظلم چھوڑ دیتے، ہم ترکِ آہ کرتے
کچھ تم، نباہ کرتے، کچھ ہم، نباہ کرتے

پر کاربند ہو کر حضرت کے تیقُّن اور اس خاک سار کے شفاف تفحص کے درمیان، چپکے سے مصالحت کی کوئی، مُرَوّت آمیز صورت نکل آئی ہے۔

اُن لوگوں سے کوئی، بنا تکِ دُھل یہ بات کہہ دے کہ نا بابا اس نوع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے، ہم نے آپس میں، ذرہ برابر بھی لین دین نہیں کیا ہے، ہم دونوں اپنے اپنے اصول و عقائد پر پہاڑوں کی طرح، ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور اس تاریخ تک کوئی ایسا قرینہ دور دور تک بھی نظر نہیں آرہا ہے کہ میں، خدانہ خواستہ، ایقان کی طرف مُڑ جاؤں۔ اور حضرت جادۂ تشکّک پر گام زن ہو جائیں گے (اللہ کرے گام زن ہو جائیں) حضرت کا عشق مجھے پھسلا رہا ہے:۔

''موری گلی آجا، ہو یا لما''

اور مری عقل ٹھُنک ٹھُنک کر کہہ رہی ہے:۔

''نجریوں سے بھر دوں گی جی، چھونے نہ دوں گی شریر''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر شدید تخالف، تباین اور تضاد کے باوجود وہ کون سی طاقت در قدرِ مشترک ہے، جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی محبت پر مجبور و مامور کر دیا ہے۔ مجھ کو بابا ذہین شاہ کے دل کا حال معلوم نہیں، اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھ کو اس قدر کیوں چاہتے ہیں۔ اور وہ میری کون سی ادائے کفر ہے، جو انہیں بھا گئی ہے۔ اس موقع پر ایک پرانی بات یاد آگئی، وہ سُن لیجئے، شاید اُس سے اس صورتِ حال پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ ایک تھیں خیر آبادی، فیروزی بجیا، اُن میں کسی قدر سنک تھی، ایک دن وہ ملیح آباد آئیں اور اُمُّ الشُّعَراء یعنی میری رفیقۂ حیات سے، بڑے استعجاب کے ساتھ کہنے لگیں بنی یہ بھونرا خان اذان کے بیچ میں میرا نام کیوں لیا کرتے ہیں۔ میری بیوی نے، مُسکرا، اُن سے کہا فیروزی بجیا کیسی باتیں کر رہی ہو، اللہ اللہ کرو، ہم نے تو بھونرا خان کی اذان میں تمہارا نام کبھی سُنا ہی نہیں بولیں، ارے تم لڑکیوں کے کان تو ٹھپ ہو چکے ہیں۔ ابھی ابھی تو انہوں نے اذان دی تھی، اللہ اکبر، اللہ اکبر، حیّ علی الفلاح حیّ علی الفلاح، فیروزی بجیا توبہ، (بضمِ ''تا'') میری بیوی نے کہا یہ بھونرا خان کو کیا لت لگ گئی ہے کہ عین اذان کے بیچوں بیچ ''فیروزی بجیا توبہ'' کہتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا کہ وہ میرا نام اذان کے بیچ میں اس لئے لیتے ہیں کہ میری کوئی ''خوبو'' واو مجہول کے ساتھ (ان کو پسند آگئی ہوگی۔ سو اگر اس خاک سار سے کوئی دریافت کرے کہ شاہ صاحب تجھ کو چاہتے کیوں ہیں تو میں بھی

فیروزی بجیا کی طرح جواب دوں گا حضرت کو میری کوئی "خوبو" پسند آ گئی ہو گی۔

اس "خوبو" کی بات کو چھوڑ کر، میں اپنی ذات میں کوئی ایسا وصف نہیں پاتا کہ کوئی پیر خانقاہ، مجھ رِند نامہ سیاہ سے محبت کر سکے۔

سودا نے شاید اسی منزل میں یہ شعر کہا تھا:۔

سودا، جو ترا حال ہے، اُتنا تو نہیں وہ
کیا جانیئے، تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

اب رہا یہ امر کہ پرستار عقل و بندۂ فکر ہونے کے باوجود، میں بابا ذہین شاہ سے کیوں محبت کرتا ہوں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب سے پہلے جس چیز نے، میرے دل کو ان کی طرف کھینچنا شروع کیا وہ ان کا چہرہ ہے۔ چہرہ، انسان کی کتابِ سیرت کی فہرستِ ابواب و مضامین اور اس کی تمام شخصیت کا ترجمان و مُفسّر ہوتا ہے۔

میں ان اندھوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، جن کو "آنکھوں کے اندھے، نام نین سکھ" کہا جاتا ہے" ان کے نزدیک تو چہرہ اور تلوار، دونوں یکساں ہوتے ہیں، لیکن بصرۃ المومنین رکھنے والے اربابِ نظر، جب کسی کے چہرے کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہیں تو ان کے لمسِ نگاہ کی چبھن سے منظور کا چہرہ بولنے لگتا ہے۔

چہرے جھوٹ نہیں بولا کرتے، چند انے گنے جرائم پیشہ افراد، سدھے ہوئے دروغ گو چہروں کے علاوہ، تمام انسانوں کے چہرے پچانویں فی صد، سچ اور سچ بولتے ہیں۔ اور ایک آن میں، انسان کے تمام رذائل و فضائل کے دفتر کھول کر رکھ دیا کرتے ہیں۔ تو بندہ پرور، جب پہلی بار میں نے ذہین شاہ کا چہرہ دیکھا تو اُس نے میرا دل موہ لیا، ان کے چہرے نے مجھ سے کہا کہ میری یہ نورانیت، میری جوانی کا وہ جمال ہے، جو، ماہ و سال کی چھلنیوں سے گزر کے مجھ پر دمک رہا ہے۔ اور یہ صرف جوانی کے جمال ہی کی سُہانی دمک نہیں، اس میں اس کے معنوی حُسن کی جگمگاہٹ کا عُنصر بھی شامل ہے، جس کا میں چہرہ ہوں۔ چہرے کے بعد زبان کی باری آتی ہے، زبان سے پتا چل جاتا ہے کہ مُتکلّم کس خاندان اور کس طبقے کا فرد ہے، اور علم و فضل کے اعتبار سے کتنے پانی میں

ہے۔ بعض اوقات چہرہ وزبان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کسی کا چہرہ شریف ہوتا، زبان رذیل ہوتی ہے، اور کسی کی زبان شریف ہوتی ہے، اور چہرہ رذیل ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ چکا ہوں کہ سب سے پہلے شاہ صاحب کے چہرے نے میرے دل پر اثر کیا، ایسے معنوی وصوری اعتبار سے، منور و مرتب چہرے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اسکے بعد جب ان سے حرف و حکایت کی نوبت آئی تو الفاظ کے رچاؤ، فقروں کے بہاؤ، اور لہجے کے ٹھہراؤ نے یہ بات میرے دل پر نقش کردی کہ میں ایک ایسے غیر معمولی مقناطیسی انسان کے روبرو بیٹھا ہوا ہوں، جس کا چہرہ بھی عالی خاندان ہے، اور زبان بھی نجیب الطرفین۔ حافظ شیرازی کا محبوب بظاہر نرم اور بباطن سخت تھا، اور اسی لئے اس نے منہ پیٹ کر کہا تھا:۔

چہ قیامت جاناں کہ بعاشقان نمودی
رُخ، ہمچو ماہ، تاباں، دلے ہمچو سنگِ خارا

لیکن میرے محبوب کے رُخ اور دل میں بڑی ہم آہنگی ہے اور اسی لئے میں یہ کہہ رہا ہوں:۔

رخے، ہمچو ماہ، تاباں دلے، ہمچو سوج کوثر

اور اب، جب کہ ہماری ملاقات پرانی ہوکر، بے تکلفی کے حدود میں داخل ہو چکی ہے، یہ سوچ کر میں بہت ہی خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے اولین تاثرات قطعی درست نکلے، اور میں نے اپنی محبت کے واسطے ایک ایسے فرد کا انتخاب کیا ہے جو صوری و معنوی، دونوں جہت سے چاہے اور سراہے جانے قابل ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا ایک ایسا غیر معمولی وصف بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو فقط پیمبروں، فلسفیوں اور حقیقی شعراء میں پایا جاتا ہے۔ (شعراء کے ساتھ "حقیقی" کی شرط میں نے اس غرض سے لگائی ہے کہ ہندوستان آکر، یہ عظیم لفظ اس قدر راوچھا ہو چکا ہے کہ یہاں ہر صاحب تخلیق موزوں طبع تک بند کو شاعر کا خطاب دے دیا جاتا ہے)۔

لیکن شاہ صاحب کے اس غیر معمولی وصف بیان کرنے سے پیش تر آپ کو کسی انگریزی فلسفی کا یہ قول سُنا دینا چاہتا ہوں کہ صدیوں کی فکری تربیت اور ذہنی تطہیر کے بعد، ہماری قوم کو شرافتِ نفس

وجاہت برداشت کی یہ دولت حاصل ہوئی ہے کہ جب ہمارے مخالفین، ہمارے منہ پر، ہمارے مسلمات کا مذاق اُڑاتے، اور ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ہم کو صلواتیں سناتے ہیں، تو ہم کو غصہ نہیں آتا، غصہ کیسا، اُن کے طعن و تشنیع اور حرفِ دشنام کو سُن کر ہم مسکراتے ہیں۔، پیشانیوں پر بل نہیں پڑنے دیتے، اور معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس وقت ہم بڑے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کرنے لگتے ہیں کہ شاتم نے جن عیوب کو ہم سے وابستہ کیا ہے، آیا ہم میں وہ عیوب ہیں کہ نہیں، اور جب ان عائد کردہ عیوب میں سے کوئی عیب ہم اپنے میں موجود پاتے ہیں تو اس سے دست بردار ہونے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ہے شاہ صاحب کا میں ان کے منہ پر اُن کے مسلمات وعقائد پر چوٹیں کرتا اور ایسی نظمیں سُناتا ہوں جن کو عرف عام میں کافرانہ کہا جاتا ہے، لیکن انکے ماتھے پر بل نہیں پڑتے، بل پڑنا تو درکنار، وہ بڑی مٹھاس کے ساتھ مسکرانے لگتے ہیں، اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے، جب مجھے اُن پر بڑا پیار آنے لگتا ہے۔ شاہ صاحب سے میری محبت کی ایک نفسیاتی وجہ اور بھی ہے جانتا ہوں کہ اس وجہ کے بیان کرنے سے میرا ایک پول کھل جائے گا۔ مگر سچ بولنے میں، ایک نہیں، ہزار پول بھی کھل جائیں تو مردانِ خدا کو پروا نہیں ہوتی۔ جناب والا، یوں تو مجھ کو اس بات پر بڑا فخر ہے کہ میں تفکر کا دیرینہ پرستار اور توہم کا کھلا ہوا دشمن ہوں۔ لیکن میرے سینے میں شاعر کا کم بخت دل ہے، جو زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے۔

میری شخصیت شبیر حسن خان اور جوش ملیح آبادی کے درمیان بٹی ہوئی ہے، شبیر حسن خان حکمت کے پُجاری ہیں، لیکن جوش ملیح آبادی افسانہ وافسوں کا دلدادہ ہے۔

شبیر حسن خاں بوڑھے ہیں، جوش ملیح آبادی ابھی تک لونڈا ہے۔ شبیر حسن خان جب تک جاگتے رہتے ہیں، جوش ملیح آبادی، ڈر کے مارے ان کے سامنے نہیں آتا، لیکن بشری کمزوری کے باعث جب شبیر حسن خان پر، اُونگھ طاری ہو جاتی ہے، تو جوش ملیح آبادی، دبے پاؤں آتا، اور میرے دامن کو "شاہد غیب" کے جمال" کی طرف کھینچنے لگتا ہے، اس لونڈے کے ساتھ، بڑی بڑی نورانی داڑھیوں کے فرشتے بھی آتے ہیں، اور جادو کے جزیرے دکھانے لگتے ہیں، اور اس وقت

خدا جانے وہ کون ہے، جو بڑی سُریلی آواز میں یہ گیت گانے لگتا ہے:۔

''گوری نکس چلو، مورے سنگ۔''

اور شاید یہ میرا جوشؔ ملیح آبادی ہے، جس نے مجھ کو شاہ صاحب پر فریفتہ کر رکھا ہے، اور یہاں تک کے جب دس بارہ دن شاہ صاحب کی مفارقت پر گزر جاتے ہیں تو میرے دل میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی اللہ خیر کرے۔ دُھائی شبیر حسن خان کی!

ایک اور بات جو شاہ صاحب کی جانب میرے دل کو پُکارتی ہے، وہ ان کی عالمانہ و شاعرانہ شخصیت ہے۔ شاہ صاحب کو مشرقی علوم پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور ان کی شاعری میں گاہ گاہ ایسے مقامات آ جاتے ہیں کہ دل پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شاہ صاحب تصوّف کے شاعر ہیں، میں تصوّف سے کوسوں دور ہوں، لیکن اُن کے بعض اشعار میں اس بلا کی جاذبیت پاتا ہوں کہ بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے اسی کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

تصوّف کے دوش بدوش حضرت کے وہاں حُسنِ مجازی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ اُن کے سینے میں ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے۔ جس کو انسانی جمال کی صیقل بنا دیا ہے۔ اور دراصل یہ حُسنِ مجازی ہی ہے جو سیرت کو جمال، شاعری کو خدوخال اور نفس کو کسا عطا کرتا ہے۔

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے، وہ دل نہیں ہوتا

حضرت کا کلام شائع ہو رہا ہے۔ اس موقع پر بے ساختہ یہ بات دل میں آئی، میرے نہیں، میرے کھلنڈرے جوشؔ ملیح آبادی کے دل میں آئی کہ میں اس کلام کے حُسنِ قبول کے واسطے اُس بارگاہِ اَحدیت میں دُعا کروں، جس نے شعراء کو ''تلامیذ الرحمٰن'' کا خطاب دیا ہے، لیکن اس بات کے دل میں آتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ حکمت کے پجاری اور تحقیق کے دلدادہ شبیر حسن کا چہرہ سُرخ ہو گیا، ماتھے پر، سیکڑوں شکنیں پڑ گئیں کہا خبردار دُعا نہ مانگنا، یاد ہے تجھ کو اپنے معنوی برادر بزرگ

اسد اللہ خاں کا یہ شعر:-

حریفِ مطلبِ مُشکل نہیں، فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

یہ سُنتے ہی میں ہوش میں آگیا ـــــ اس لئے دعا سے توبہ کرکے، اب میں یہ کہوں گا کہ میری یہ دلی تمنا ہے کہ حضرت کا دیوان قبولِ خاطر کا تاج پہنے، اور لوگ اس کو سرآنکھوں پر جگہ دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ میری یہ آرزو بھی ہے کہ شاعر صاحب اور شاہ صاحب کی محبت نے درویشی و زندگی کا جو سنگم بنایا ہے، اس کا پاٹ روز بروز بڑھے، اور بڑھتے بڑھتے بے کراں ہو جائے۔

تُرا، از الست ، ہردم تازہ عشقے
تُرا، ہر ساعتے ، حُسنِ دگر باد

کراچی ـ ۳۰/۴/۶۶
(آیاتِ جمال، کراچی ۱۹۶۷ء)

صفیہ شمیم کی رباعیات

صفیہ شمیم ملیح آبادی میری حقیقی بھانجی ہے۔ اس کی ماں انیس جہاں بیگم بھی شعر کا بہت اچھا ذوق رکھتی ہے اور اچھے شعر سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ کبھی تو سر دُھننے اور کبھی رونے لگتی ہے۔ اسی طرح میری مرحومہ بڑی بہن افسر جہاں بیگم بھی ادب و شعر کی بیحد قدرداں اور گرویدہ تھیں جس کا اندازہ اس چھوٹے سے واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ انگنائی میں بیٹھی شعر و سخن کی باتیں کر رہی تھیں کہ میرے بڑے بہنوئی یعنی مرحومہ کے شوہر نے بڑی تعریف کے ساتھ کسی کا شعر اُنہیں سُنایا۔ شعر سُنتے ہی غصّے سے اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور شوہر سے کہنے لگیں کہ اول تو گھٹیا شعر سُناتے ہو اور پھر اضافت بھی کھا جاتے ہو۔

اسی طرح گھر کی تمام بڑی بوڑھیوں کو بھی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ بات بات پر کہاوتیں کہی جاتیں اور شعر پڑھے جاتے تھے۔ اور میر انیس کا کلام تو گویا سب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

یہ تو صفیہ کے گھر کی اندرونی ادبی فضا تھی اور اُس پر طرّہ یہ تھا کہ بیرونِ خانہ سے بھی ادب کے جھونکے برابر آتے رہتے تھے۔ والد مغفور کی صُحبت میں ہر روز شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ہر مہینے مشاعرے ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور دیگر مقامات کے اکابر شعراء ہمیشہ آتے جاتے رہتے اور دو چار مشہور شاعر تو ہمیشہ مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہی رہتے تھے۔ یہ تھا مسلسل چار پشتوں کا ادبی ماحول، اور پھر شمیم کی فطری شاعرانہ صلاحتیں، ان دونوں نے مل جُل کر شمیم کی شاعری کو اس طرح اُبھارا اور نکھارا کہ اُس نے شاعری کے اُس مقام سے ابتداء کی جو دوسری شعر گو خواتین کا نقطۂ انتہا ہوتا ہے۔

شمیم کو قُدرت نے پگھلا اور حساس دل عطا فرمایا ہے۔ وہ معمولی چیزوں سے بھی وہ اثر قبول

کرتی ہے جو دوسرے غیر معمولی چیزوں سے بھی قبول نہیں کرسکتے۔

یہ بلا کی شدتِ احساس شمیم کی خوش قسمتی بھی ہے اور بدبختی بھی، اس سے شعر میں تو جان آ جاتی ہے، لیکن دل کی جان نکل جاتی ہے۔

پیشِ نظر مجموعہ (گریۂ شبنم) شمیم کی رُباعیات پر مشتمل ہے۔ رُباعی ایسی زہرہ گداز چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکّے چھڑوا، اور اچھے سے اچھے شاعروں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔ یہ کمبخت صنف موزونیٔ طبع، شعری ذوق، ذہانت اور تخئیل کے بَل بوتے پر قابو میں آنے والی چیز ہی نہیں، یہ نامُراد رُباعی تو مطالبہ کرتی ہے۔ ٹھوس تجربات، عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات کا، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ظالم اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ شاعر اپنے افکار کے عطر کو ایسے نوک پلک کے قلیل الفاظ میں ادا کرے جس سے کثیر معنی اُجاگر ہو جائیں اور جنونِ شاعرانہ اور عقلِ حکیمانہ کو اس انداز سے سمو دیا جائے جس انداز کے ساتھ سنگم میں گنگا اور جمنا کے دھارے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

شمیم کی عمر، اُس کے مشاہدات کی کمی اور (چوں کہ وہ چالیس سال سے بہت کم ہے) اس لئے اُس کی چالیس سال سے پیشتر کی مُسلّمہ دماغی خامی پر جب نظر ڈالتا ہوں اور اُسی کے دوش بدوش جب اپنی عورتوں کی موجودہ عقلی وفکری سطح کو بھی دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے شمیم کی رُباعیاں پڑھ کر۔

یہ سب کیسے ہوا، یہ سب کیسے ہو سکتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن یہ ایک ایسی حیرت ہے جو موذی ہونے کی عوض، میرے دل و دماغ کو انتہائی مسرت کی موجوں سے شاداب کر دیتی ہے۔

میری بچّی کیسی اچھی رُباعیاں کہتی ہے جب یہ سوچتا ہوں تو مجھے، کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ یہ وہ خوشی ہے جس کا اظہار میرے کیا کسی کے بس کی بات نہیں۔

"آدمی محسوس کرسکتا ہے کہہ سکتا نہیں"

(۲۳۔ نومبر ۱۹۵۱ء، دہلی)

شاعری کا مستقبل

شاعری روز بروز زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے۔

ہم موجودہ شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں جدید نظریوں اور تحریکات کے زیرِ اثر جو شاعری ۱۹۳۶ء کے بعد پیدا ہوئی ہے، وہ اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے موجودہ شاعری سے بلند و برتر ہے کیا سبب کسی تحریک یا نظریہ کا فقدان ہے؟ اگر ایسا ہے تو اُردو کی قدیم شاعری جس کے سامنے کوئی تحریک بھی نہیں تھی اور نہ کوئی مقبول نظریہ کیسے وہ معیار قائم رکھ سکی، جو بعد کی شاعری میں کم سے کم ہوتا چلا گیا۔؟''

اُردو شاعری کو بڑی شاعری کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہماری زبان میں حقیقی شاعری بہت کم ہوئی ہے، جس کی ذمے دار غزل ہے۔ ہمارے پاس شاعری کا جتنا انبار ہے اس کا اٹھانوے فیصدی غزل ہے، اور غزل ایک فطری صنفِ سخن کے اعتبار سے ناقص ہے۔ کسی شاعری میں کچھ شعر نکل آنا اس کی بڑائی کی دلیل نہیں ہے۔

اُردو میں چند گنے چنے شاعروں کے علاوہ اگر کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے غزل کو شعر سمجھ لیا، اور جس شاعر کو نمک حرامی کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا وہ ایک ایسا شاعر تھا جس کا تذکرہ بار بار ہونا چاہیئے تھا اور اسی کا راستہ اختیار کر کے شاعری پیدا کی جا سکتی تھی، مگر ہم لوگ اس کی برسی تک نہیں مناتے میرا اشارہ نظیر اکبر آبادی کی طرف ہے، جسے بھلا دیا گیا۔

جہاں تک بڑی شاعری کا تعلق ہے تو قدرت اس صنف کے بڑے آدمی پیدا کرنے میں ہمیشہ محتاط رہی ہے۔ ڈھائی سو برس کی شاعری میں کبھی ایک آدمی پیدا ہوا ہے۔ نئی شاعری سے نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ اگر یہ بڑی شاعری نہیں ہے، تو کچھ عرصے بعد بڑی شاعری پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۹۳۶ء کی شاعری کیا ہے، یہ ہمیں نہیں معلوم۔ ہم سے نام لے کر بات کیجیے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اگر کسی شخص سے اُمید کی جاسکتی تھی کہ وہ درجۂ اوّل تک جائے گا تو وہ مجاز تھا۔ وہ بے چارہ خودکشی کر چکا ہے۔ فیض رومانی شاعر ہیں ان میں شاعری کا جوہر ہے۔ ان کی طبیعت میں اُبل پڑنے کی کیفیت ہے، مگر حالات نے انہیں سیاسی شاعر بنا دیا، اسی لیے وہ زیادہ نہیں چلے۔ جب تک وہ رومانی نظمیں کہتے رہے جیسے وہ نظم تھی۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' انکی شاعری میں رنگ رہا۔ مگر جب وہ سیاست کے رنگ میں بڑھے تو پبلک ڈیمانڈ پر شعر کہنے لگے۔ ناموری کی تمنا نے انہیں خراب کر دیا۔ ان کے اور ساتھیوں میں جوہر تو ہے، مگر ایسا کوئی نہیں ہے جو درجۂ اوّل تک جائے۔

آجکل کی شاعری کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم، میں ان لوگوں کو نہیں جانتا، نہ دیکھنے کی فرصت ملتی ہے۔ کبھی کبھی رسالہ اُٹھاتا ہوں تو بلینک ورس دیکھ لیتا ہوں۔ یہ لوگ غزلیں اور نظمیں بھی کہتے ہیں، مگر سب بچے نظر آتے ہیں۔ ان میں آگ نہیں ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اہم معلوم ہوں۔ یہ پودے ہیں، بہت چھوٹے پودے۔ ان کے جل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دراصل شاعری کا جائزہ صحیح معنوں میں دو ڈھائی سو سال کے بعد لیا جاتا ہے۔ اس شاعری کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے زمانے میں باون باون گز کے شاعر تھے، مگر آج اُن کا ذکر تک نہیں۔ مقبولیت کی بات کیجیے گا تو داغ کا جیسا طوطی بولا، وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مگر آنکھ بند ہوتے ہی بُھلا دیا گیا۔ شاعری پر تقسیم کا اثر بھی بہت پڑا۔ لوگ اپنے اپنے حصے اس لیے دبا کر بیٹھ گئے، کہیں دوسرے لوگ ہمارے حصہ دار نہ بن جائیں۔ شاعری پھیلنے کے بجائے محدود ہوگئی۔

لیکن ایک بات ہے کہ انسان کی ہر بات میں ایک تغیر آرہا ہے۔ وہ اب عقل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شاعری محسوسات کو سامنے رکھتی ہے اور ہمارا شعور سائنس اور فلسفے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب وہ شاعری پنپے گی جو اپنا موضوع سائنس اور فلسفے کو بنائے گی۔ پہلے عشق کرنا بہت مشکل تھا، محبوب کی شکل دیکھنا بھی بہت دشوار تھا۔ اسی لیے ہجر کی راتیں بھی اب وہ نہیں رہیں۔ عاشقی

آسان ہوگئی ہے۔ عقل کا دور ہے، اس لیے شاعر کو شہوانیات سے وابستہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات میں نے پچھلے چندہ بیس سال میں محسوس کی ہے اور میرے یہاں اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اسی لیے میری موجودہ شاعری پہلی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات کہتا ہے، تو کڑک ہوگیا ہے۔ حسن و عشق کی بات کرو تو کہتے ہیں زندہ ہوگیا ہے۔

ہمارے شعراء اور صوفیا نے عقل کو ذلیل کیا ہے اور جنون و عشق کو بڑھایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم عقل کو شیطانی کام سمجھتے ہیں۔ ہماری شاعری نے عقل اور تفکر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ نشہ چار سو برس کا ہے، یہ کیسے اُتر سکتا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ عقل سے بڑی فضیلت کوئی نہیں۔ از زمین تا آسماں عقل ہے، اور عشق صرف نسل انسانی بڑھانے کا ایک ذریعہ۔

شاعری عقل کا راستہ اختیار کرے گی تو پنپے گی، ورنہ مر جائے گی، لیکن عقل کا راستہ اختیار کرنے سے پہلے ایک بات اور سن لیجیے۔ زبان کے انحطاط کے ساتھ شاعری بھی زوال پذیر ہوتی جاتی ہے۔ شاعری الفاظ کے سہارے ہی ہوتی ہے۔ اور آج کی شاعری الفاظ کو بھول رہی ہے۔

○

کچھ اُردو کے باب میں

اُردو کی برومندیاں اور بدبختیاں تقریباً مساوی طور پر نشاط انگیز و عبرت ناک ہیں۔

اس کی برومندی کا تو یہ عالم ہے کہ پیدا ہوتے ہی یہ نئی نویلی اس انداز سے پھبکی اور اس آواز سے چنکی کہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ اس کے معطر انفاس سے مہک اُٹھا، اور دور دور تک اس کی صداؤں کے شعبے گونجنے لگے اور ان اجانب کی زبانوں پر بھی اس کے الفاظ چڑھ گئے جن کے گلے تالو کی ساخت اس کے مخارج سے قطعی طور پر مختلف واقع ہوئی تھی۔

اُردو زبان کی یہ اُٹھان ایک قدرتی بات تھی، اس لیے کہ بازاروں اور درباروں نے، کاندھوں سے کاندھا ملا کر اسے ابھارا تھا، سیف وقلم نے متحد ہو کر اس کو سہارا دیا تھا، رندی و درویشی نے ہم زبان ہو کر اس کی آواز کو نکھارا تھا، مستوری ومستی نے، ہم سطح ہو کر اس زمین کو ہموار کیا تھا، سبحہ وزنار نے ہم رشتہ ہو کر، اس کی زلفوں کو سنوارا تھا، گنگامائی اور آب کوثر نے ہم دوش ہو کر اس کو روانی کا درس دیا تھا، اور کعبہ وکاشی نے اپنے تمام اختلافات کو پس پشت ڈال کر، اس کے ایوان کی تعمیر میں برابر کا حصہ لیا تھا۔

اور اس زبان کی بدبختی یہ تھی کہ یہ تاریخ کے اس موڑ پر پیدا ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی حکومت کا جاہ وجلال، مسکنت وخاک نشینی کی وادیوں کی جانب مڑ چکا تھا، معاشرے میں جسمانی و معاشی اور فکری وعلمی انحطاط کا زہر پھیل چکا تھا اور غیر معتدل تن آسانی وعیاشی کے خیمے ہر طرف نصب ہو چکے تھے۔

اسی کے دوش بدوش اس کی دوسری بدبختی یہ تھی کہ اس دور کے ارباب علم وادب فارسی اور کسی قدر عربی کے شیدائی تھے اور اسے منہ لگانا توہین خیال کرتے تھے۔

لیکن چوں کہ اس نئی زبان کو تاریخ کے ایک تقاضائے محکم نے پیدا کیا تھا، اس لیے اس نے حالات نامساعد کا خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔ کارخانوں، چھاؤنیوں، بازاروں، منڈیوں، گلی کوچوں اور

میلوں میلوں میں ایک آہستہ خرام لیکن ضدی نہر کے مانند مسلسل بہتی رہی اور یہاں تک کہ اس نے ہندوستان کے عوام کے جذبۂ کلام و ذوق ابلاغ کا احاطہ کر لیا اور آخرکار اس کی لہریں خواص کے محلوں تک سے ٹکرانے لگیں۔

اس کے بعد اس البڑ پر شعراء و صوفیاء کی نگاہ پڑی اور ان دونوں نے اسے پروان چڑھانا شروع کر دیا۔

صوفیاء و شعرا کی صحبت سے اس زبان کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ پہنچا کہ اس میں عشق مجازی و "عشق حقیقی" کی نئی نئی اصطلاحیں پیدا ہو گئیں، اس کی محفل میں دعائیں اور سارنگیاں گونجنے لگیں، چوکوں کے کوٹھوں، خانقاہوں کے قبوں، قوالی کے جلسوں، رقص و سرود کی محفلوں اور مشاعروں کے دائروں سے نکل نکل کر اس کے الفاظ دور دور تک سفر کرنے اور سینوں میں اترنے لگے اور ان صوفیاء و شعراء کے فیضان صحبت نے ہماری زبان کے خزانے میں جھلجھلاتے الفاظ، جگمگاتے کلمات اور ترشی ہوئی ترکیبوں کا ایک گراں قدر انبار لگا دیا اور جہاں تک کہ عاشقانہ و صوفیانہ خیالات کا تعلق ہے، انہوں نے ہماری زبان کو بے باکانہ خطریات، جنسی کلمات، اعلان ہیجانات، مابعدالطبیعاتی تصورات، حسن و عشق کے علامات اور رزمیہ و مناجات کے حرف و حکایات سے اس قدر مسلح کر دیا کہ ہم بلبل ہزار داستان بن کر چہچہانے لگے۔

اور ہماری زبان کو ان صوفیاء و شعراء سے نقصان یہ پہنچا کہ چوں کہ یہ دونوں گروہ عموماً سے بالعموم تقریباً بے نیاز اور خالصتاً پابند سوز و گداز تھے، اس لئے ہماری زبان عالمانہ انداز، محققانہ طرز بیان او مجتہدانہ انداز کلام تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔

ان بزرگوں نے ہمارے دلوں کو تو جلا بخشی لیکن ہمارے دماغوں میں شمعیں نہیں جلائیں، انہوں نے تقلید کے قبے تو بنائے، اجتہاد کے ایوان تعمیر نہیں کیے، انہوں نے ذکر کے ترانے چھیڑے، فکر کے بربط کو نہیں اٹھایا، تصور جاناں کا درس دیا، مطالعۂ کائنات کے دریچے بند کر دیے، اقوال کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور افکار کی خلاقی کو روند ڈالا۔

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہم ہلکی پھلکی صحبتوں، ضلعے جگت کی محفلوں، غزلوں کے اکھاڑوں،

میلوں ٹھیلوں کی چھولداریوں حسن کے بازاروں اور جاہل بادشاہوں کے درباروں میں تو بڑے مزے سے بے تکلف چہچہانے لگے، لیکن علوم کے ایوانوں اور مشاہدہ و تحقیق کی سرکاروں میں ہماری سائنس رک کر رہ گئی اور ہم گونگوں کے مانند حیران و پشیمان ہو کر رہ گئے۔ اس لیے کہ ہمارے سروں پر نہ تو محققانہ خیالات ہی کا سایہ ہے اور نہ ہماری زبانوں پر عالمانہ الفاظ ہی پرتو فگن ہیں۔

میرے کہنے پر نہ جائیں، آپ کو خود ہی اپنی زبان کے تمام نثری و شعری سرمائے پر نگاہ دوڑائیں کہ اس میں رکھا ہی کیا ہوا ہے۔

آپ کے نثری سرمائے میں طوطا مینا کی کہانیاں ہیں، پریوں، دیووں، جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے ہیں، نل دمن اور لیلیٰ مجنوں کی حکایتیں ہیں، کنویں میں چھپا کے گر جانے کے بعد اس کے پانی کی صفائی کے ہدایات ہیں، ترک دنیا اور بے جا توکل و قناعت کی نصیحتیں ہیں، درویشوں کی کراجتیں ہیں "بزرگوں" کے ملفوظات ہیں، تعویذ اور گنڈے ہیں، ٹھیلے کا مرغا ہے اور شیخ سدو کا بکرا۔

اسی طرح آپ کے شعری سرمائے میں بازاری عورتیں ہیں، گلیوں کے [illegible] یب رو سیاہ ہے، بے دہن و کمر کے فرضی معشوق ہیں، دنیا کی بے ثباتی ہے، وصل و ہجر کا رونا ہے، سرمہ ہے، کاجل ہے، انگیا ہے، جوبن ہے، بوس و کنار ہے، زاہدوں پر طعن و تشنیع ہے، ناصحوں کی اہانت ہے، پرائی بہو بیٹیوں کی تاک جھانک ہے، عاشقوں کی ہڈیاں ہیں اور ان ہڈیوں پر کوئے یار کے کتوں کی لڑائیاں ہیں۔

ہر چند عصر حاضر میں ہمارے نثری سرمائے کے دائرے میں، زیادہ تر تراجم کی معرفت کچھ علوم داخل ہوئے ہیں، اور ہمارے شعری میدان پر بھی تخلیقی و فکری ادب کا پرتو پڑ رہا ہے، لیکن ابھی تک وہ اس قدر ابتدائی دور میں اور اس قدر کم ہے کہ اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی، اور آج تک یہ عالم ہے کہ ہم لوگوں میں جو شخص اُردو داں ہیں، انہیں جاہل کے علاوہ اور کوئی لقب نہیں دیا جا سکتا۔

ان عبرت ناک حالات میں، انتہائی خوف آمیز سنجیدگی کے ساتھ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ

ہماری زبان اور ہمارے خیالات میں کیوں کر توانائی، گیرائی اور وسعت پیدا کی جاسکتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ، ہمیں یہ عزم بھی کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے زبان کی سکڑاہٹ اور اپنے افکار کی بھچاوٹ سے اب دیر تک صلح نہیں کریں گے، اور اس سے اعلان جنگ کر کے آگے بڑھ جائیں گے۔ یہ اعلان جنگ اس طرح ہوسکتا ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے، نصاب ایسا مرتب کیا جائے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ دارالترجمہ و دارالتصنیف قائم کیا جائے، آکسفورڈ ڈکشنری کے معیار کی فرہنگ مدون کی جائے، جدید الفاظ، اسماء و محاورات، مرکبات اور ضرب الامثال کی تسکیک کے واسطے ایک لسانی دارالضرب قائم کی جائے، اور اخباروں، رسالوں، لکچروں، فلموں اور ریڈیو کی وساطت سے جدید الفاظ وافکار کو مستقل و مسلسل نشر کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ نہایت وسیع پیمانے پر کتب خانے قائم کیے جائیں، اقطاب علم و اماماں ادب کو فکر معاش سے قطعی طور پر آزاد کر کے، تخلیقی کارناموں کی فرصت بخشی جائے اور ان کی کتابوں کی اشاعت کا معقول بندوبست کیا جائے۔

آپ کو معلوم ہے کہ زمیں داروں، نوابوں، اور جاگیرداروں کی کاہل اور نکھٹو اولاد، آباؤ اجداد کی کمائی ہوئی دولت و جاگیر میں کوئی اضافہ نہیں کرتی، بلکہ اسے بیچ بیچ کر کھاتی رہتی ہے، زبان و خیالات کے معاملے میں بھی ہماری یہی روش ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جس قدر الفاظ ہمارے واسطے جمع کر دیے ہیں، ہم ان میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرتے، اضافہ کرنا تو بڑی بات ہے ہم ان الفاظ کے ذخیرے کو فراموش کاری اور ذوق متروکات کے ہاتھوں روز بروز کم کرتے چلے جارہے ہیں۔

علمی الفاظ و مصطلحات کا تو ذکر ہی کیا، ہم ادبی الفاظ میں بھی اضافہ نہیں فرمارہے ہیں، ہم نے یہ تو جان لیا ہے کہ

''بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست''

لیکن ان ''بے شمار عشوہ ہائے بتاں'' کے نئے نئے نام رکھنے کی بھی اب تک ہم کو توفیق نہیں ہوئی ہے، اسمائے نو کی تخلیق و تسکیک تو بڑی چیز ہے، ''عشوہ ہائے بتاں'' کے جو نام ہماری گرہ میں

بنے بنائے موجود تھے، انہیں بھی ہم فراموش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور زبان کے معاملے میں بھی ہمارا وہی حشر ہونے والا ہے، جو زمیں داری کے معاملے میں ہو چکا ہے۔

ہم تو وہ ہیں، نام خدا، جو ہر نئی چیز یا بات کو "بدعت" سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے روزگار نے ایجاد و اختراع کے دروازے ہم پر بند کر دیے ہیں، اور یہاں تک کہ الفاظ کی تخلیق کا جوہر بھی ہم سے چھین لیا ہے۔

کاش ہم محسوس کر سکیں کہ ہماری زبان کس قدر تنگ و محدود ہے، اور تو اور، ہماری زبان میں تمام جانوروں، تمام درختوں، تمام پھولوں، اور تمام جڑی بوٹیوں وغیرہ کے نام نہیں ہیں، جانداروں کے بچوں اور ان کی بولیوں کے بھی نام نہیں ہیں، علم الحقائق کا تو ذکر ہی کیا، ہماری زبان میں علم الاسماء بھی شرم ناک حد تک محدود ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کاش ہم یہ بھی محسوس کر سکیں کہ اس تنگ دامانی کے باوجود ہماری زبان میں اس بلا کی لچک اور اس قیامت کی حمک پائی جاتی ہے، اور اس میں قبول پہنائی اور وسعت آمادگی کا وہ جوہر موجود ہے کہ یہ جدید مفردات و مرکبات کو بطیب خاطر قبول اور دیگر السنہ کے الفاظ و اسالیب کو بہ آسانی ہضم کر کے جزو بدن بنا سکتی ہے، اور صرف دس سال کی مدت میں اس قابل ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کی وسیع ترین زبانوں سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ لیکن سوال اور بڑا ٹیڑھا سوال یہ ہے کہ گھنٹی کون باندھے، یعنی اس کام کا بیڑا کون اُٹھائے۔

نباضان اُردو میں سے نوے فیصدی قبروں کے گوشوں کو بسا چکے ہیں، اب رہے دس فیصدی، سو روزگار نے انہیں روٹی کی تلاش میں اس طرح ہانک رکھا ہے کہ انہیں اس کام کی فرصت ہی نہیں ملتی، جس کام کے واسطے وہ پیدا ہوئے ہیں۔

چیست یاران طریقت
بعد ازیں تدبیر ما؟

O

واحسرتا۔۔۔حسرت موہانی کے انتقال پر

چودھویں مئی کے "اس تیلس مین" کی سُرخی Maulana Hasrat Dead کی پڑھتے ہی دل سے خون کی بوندیں ٹپک پڑیں آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، سر چکرانے لگا اور دل پر اُس نامراد دل پر جس میں اب جان باقی نہیں رہی ہے، کچھ ایسی ناقابلِ شرح قسم کی چوٹ لگی کہ اس منحوس خبر کی تفصیل پڑھے بغیر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتوں سے کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گیا۔

اُردو بے یار و ناصر اُردو کا ستارہ گردش میں آچکا ہے______ موت نے اُسے اپنے شکار کی خاطر منتخب کرلیا ہے______ نہیں، اب مشاہیر اردو میں سے کوئی نہیں بچے گا______ اب کوئی نہیں بچے گا__ ایک متنفس بھی نہیں بچے گا______ اچھا، اگر قضا و قدر کا یہی منشاء ہے اور لیل و نہار کا یہی فرمان ہے تو کوئی پرواہ نہیں سرِ تسلیم خم ہے بہت اچھا اُتار دیا جائے تمام بدنصیبوں کو موت کے گھاٹ۔اس لئے کہ مرجانا کہیں بہتر ہے۔اس جینے سے

اس مرگِ طویل النزاع کے ہولناک دور میں، جب کہ ہر شاعر و ادیب اپنا جنازہ خود اپنے دوش پر اُٹھائے پھر رہا ہے، موت اور صرف موت ہی وہ تنہا چیز ہے جس سے جمعیتِ خاطر اور قدر افزائی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

بے شک ہماری تمام بہترین اُمیدیں اب موت ہی پر منحصر ہو کر رہ گئی ہیں__ اور یہ منزل "منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید" وہ اُمید کش، منزل ہے جہاں نغمۂ حیات کی بالیدگی کا تو کیا ذکر، نوحہ سُمات بھی بھرپور نہیں ہوسکتا__ اور جی بھر کے ہنسنا تو درکنار، دل کھول کر رو یا بھی نہیں جاسکتا

___ کیونکہ اس منزل میں مرنے والے کی میت پر جب ماتم کیا جاتا ہے، تو ابھی ماتم کی ابتدا ہی ہوتی ہے کہ یکا یک اُس مرنے والے کی زندگی کی دردناکیاں ذہن میں اُجاگر ہو جاتی ہیں اور اُن کے اُجاگر ہوتے ہی دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ہمارا یہ ماتم سفاکانہ خودکامی کے سوا کچھ اور نہیں۔ کیونکہ ہم مرنے والے کے بلائے زندگانی سے نجات پا جانے پر آنسو بہا رہے ہیں اس خیال کے ساتھ ہی ہمارے نالہ شیون کی نبضیں ساقط ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بارہا دل کہتا ہے میاں کون سے لڈو بٹ رہے ہیں اس نامراد زندگی میں کہ کسی کی موت پر ماتم کیا اور کسی کی درازیٔ عمر کی دُعا کی جائے کس قدر جواں بخت ہیں مرجانے والے، بہ اقساط مرنے والے کہ اپنی آخری قسط ادا کر کے رُوپوش ہو گئے ہیں اور کس حد کے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کی قسطیں ابھی ادا نہیں ہوئی ہیں اور آج بھی رُسوائی و بے چارگی کے راستوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔

حسرت موہانی اپنی آخری قسط ادا کر کے شاہراہِ ناقدری و انگشت نمائی سے اُٹھ کر وہاں چلے گئے ہیں، جہاں ''خدا'' کے فضل و کرم سے ہم سب کو جانا ہے ___ اگر مجھ پر عقل کی فرماں روائی ہوتی تو حسرت کی قیدِ حیات و بندِ غم سے رہائی پا جانے پر ایک جشن کا اہتمام کرتا، اور شادیانے بجاتا ___ لیکن ایک مدت دراز کی مشقِ عقل کے باوجود میں ابھی تک جذبات کا غلام اور مردِ خام ہوں، اس لئے حسرت کے پائے وجود کی وہ زنجیر جواب زمین پر اُتری ہوئی پڑی ہے، مری رگ رگ میں شیون کی ایک گونج اور فریاد کی ایک جھنکار پیدا کئے ہوئے ہے ___

حسرت کی شخصیت و شاعری کے باب میں کیا لکھوں ___ کون نہیں جانتا کہ میرا یہ مرحوم پڑوسی، اگر سیاست کے میدان میں ایک سرفروش مُجاہد تھا تو ادبیات کے گلستاں کا بلبلِ ہزار داستاں تھا۔

حسرت صاحب دُھن کے پکے، بات کے دھنی، وضع کے پابند، قناعت کے مرکز اور اصول پرستی کے پیغامبر تھے اور اُن کی شاعری میں ماضی و حال کچھ اس طرح سمویا ہوا تھا کہ قدامت پرست اور جدّت پسند دونوں اُن کے مداح تھے۔

سیاست، شریف آدمیوں کا پیشہ نہیں۔ لیکن یہ حسرت ہی تھے کہ اس کوئلے کی دلالی میں عمر عزیز گنوا دی اور مرتے دم تک بے داغ رہے۔ اور تمام زندگی تمام طاغوتی دیوتاؤں کو للکار للکار کر کہتے رہے۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے

شاید لوگ ابھی بھولے نہ ہوں گے کہ یہ حسرت ہی تھے جنھوں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلی بار آزادیٔ کامل کا آوازہ بلند کیا تھا___ اور یہ وہ وقت تھا کہ آزادیٔ کامل کے تصور سے بھی عوام تو عوام، خواص تک کانپ اُٹھتے تھے۔

قیدِ فرنگ کے مسلسل شدائد میں بھی اُنھوں نے ''مشقِ سخن'' کو جاری رکھا اور چکّی کی آواز سے تال کا کام لیا___ اس لئے کہ وہ ''ایک طرفہ طبیعت'' کے آدمی تھے۔

انسان کی تمام زندگی اور اُس کی زندگی کے ہر ایک دقیقے کو نگل کر ڈکار تک نہ لینے اور مزید وقت کا تقاضی کرتی رہنے والی سیاسی مصروفیتوں کی لانہایت اور کاروں در کارواں ہجوم میں جب کہ سر کھجانے کی فرصت بھی میسّر نہیں ہوتی۔ حسرت کے ذوقِ سخن کا جاری رہنا کچھ ایسی بات معلوم ہوتی ہے، جسے خرقِ عادت یا کرامت نہیں، بلکہ معجزہ کہا جاسکتا ہے۔

برکفے جامِ شریعات، برکفے سندانِ عشق   ہر ہوس ناکے نہ داند جام و سنداں باختن

اور ان تمام غیر معمولی خصوصیات کے دوش بہ دوش سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حسرتِ موہانی حقیقی معنیٰ میں ایک انسان بھی تھے۔ وہ راست افکاری، راست گفتاری، راست کرداری، حلم و بُردباری، اصول پرستی، جواں مردی، قناعت دوستی، محبت نوازی، خودداری اور خلوص پروری کے ایک ایسے اوتار تھے کہ اگر فرشتوں کا وجود ہوتا اور اُن میں وہ تمام اوصاف ہوتے جو اُن سے منسوب کئے جاتے ہیں، تو حسرت کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے سے اُن کی پیشانیاں شمس و قمر بن کر چمک اُٹھتیں۔

کس قدر ترس آتا ہے مجھے اپنی بے چارگی پر کہ محفل دھڑا دھڑ خالی ہوتی چلی جارہی ہے، اور قافلوں پر قافلے گزرتے چلے جارہے ہیں لیکن میں فرشِ حیات پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا ہوں، حالانکہ خیمۂ احباب سونا ہو چکا ہے بجھی ہوئی شمعوں کا دھواں فضا میں گونجا ہوا ہے۔ پروانوں کی خاک تک اُڑ چکی ہے، مگر میں اب تک اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہُوا ہوں۔ یہ جمود ہے، بے حسی ہے، یا بے کسی، کیا معلوم۔ میرے سر پر کتنے محبوب دوستوں کی خاک گو رجمی ہوئی ہے اور میرے بالوں میں کتنے یارانِ رفتہ کی سفیدی جھلک رہی ہے لیکن میں اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔

قدرت کی سفا کی شاید یہ چاہ رہی ہے کہ مجھے "اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو" کی اُس منزل میں ہلاک کرے جب کہ میری دماغی برادری والوں میں سے ایک بھی مجھ پر رونے کے واسطے باقی نہ رہے۔

قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(۱۴ مئی ۱۹۵۱)

o

فانی مرحوم

فانی مرحوم کا نام تھا شوکت علی خاں، وطن تھا بدایوں اور خاندان تھا افغانی۔ وہ ایک دبلے پتلے، گندمی رنگ کے چھریرے آدمی تھے اور جب اپنا کلام سناتے تھے تو اس قدر زیر و بم کے ساتھ کہ سامعین پر غم کا سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ میں ان سے پہلی بار لکھنؤ میں ملا تھا سن یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ یادش بخیر میری مسیں بھیگ رہی تھیں اور وہ نوجوانی کی منزل کے آخری حصے سے گذر رہے تھے۔

وہ لکھنؤ میں امین آباد پارک کے ایک بالائی حصے میں رہتے اور وکالت کرتے تھے۔ ان کی وکالت کبھی چلی نہیں۔ اس لئے کہ مؤکلوں کے تابع کرنے گُر انہیں آتا نہیں تھا اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بے چارہ مؤکل پیشی کے دن صبح کو آتا تھا لیکن فانی اسے ٹال دیتے تھے۔ اس لئے کہ شعر خوانی اور دل کی رام کہانی کا سلسلہ وہ توڑ نہیں سکتے تھے جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا ذوقِ سخن اُبھرتا اور ان کا شیرازۂ وکالت بکھرتا چلا گیا اور غریب کو پتا بھی نہ چل سکا کہ میری معیشت کا دھارا ایک بڑے ریگستان کی جانب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

معاشرتی ابتری کے ساتھ ساتھ اس بچارے کے معاشقے کے اندر بھی فساد رونما ہونے لگا۔ چنانچہ وہی ہُوا جو ہونے والا تھا۔ ایک طرف تو ان کی معاشی زندگی کی نبضیں چھوٹ گئیں اور دوسری طرف ان کی عاشقانہ زندگی میں ایک رقیب روسیاہ کے ہاتھوں ایک ایسا زبردست زلزلہ آ گیا کہ ان کی پوری زندگی کا تختہ اُلٹ کر رہ گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں وہ اپنا بوریا بستر باندھ کر لکھنؤ سے

آگرہ چلے گئے۔

بہ نومیدی حزیں از کوئے او بار سفر بستم　　خدا صبرے کند روزی دل اُمید وارم را

لیکن آگرہ میں بھی فانی آسودگی سے دو چار نہیں ہو سکے۔ حالانکہ اس وقت وہاں لطیف (ل۔احمد) میکش، مخمور، شاہ دلگیر اور حافظ امام الدین کی سی ہستیاں موجود تھیں اور اس کے ساتھ مجھو جان وغیرہ کی رومانی و رنگین صحبتیں بھی شباب پر تھیں۔ لیکن ان بھری صحبتوں میں بھی فانی اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے اور ان کا یہ عالم تھا:۔

آگیا جب کوئی کرلیں چار باتیں اس سے بھی　　پھر وہی سر پھوڑنا جس وقت تنہائی ہوئی

آگرہ سے فانی نے مانی صاحب کے ساتھ ایک ماہ نامہ ''تسنیم'' کے نام سے جاری کیا تھا لیکن رسالے کا چلانا فانیوں اور مانیوں کے بس کا روگ نہیں۔ اس لئے وہ چند روز ہی میں بند ہو گیا ''تسنیم'' کے واسطے سے فانی صاحب نے مجھ سے میرا کلام طلب کیا تھا، تو اس وقت میں نے انہیں لکھا تھا کہ تم کمبخت تسنیم و شمیم سے کھیل رہے ہو اور ملک میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اپنی شاعری کی باگ انگریز کے خلاف موڑ دو اور یہ غزل کی مصنوعی شاعری چھوڑ دو تو اس لکھنے پر انہوں نے جل کر مجھے لکھا تھا۔ میاں یہ روش تم کو مبارک ہو۔ ہم اپنی شاعری کو سیاست کی جانب موڑنا پسند نہیں کرتے اور تم جو یہ اعتراض کرتے ہو کہ میں نے رسالے کا نام ''تسنیم'' کیوں رکھا تو اس کے جواب میں سوال کرتا ہوں کہ ''تسنیم'' نہیں تو کیا رسالہ کا نام ''ہتھوڑا'' رکھتا؟''

اس خط و کتابت کے بعد وہ بہت دن تک روٹھے رہے اور اس کے بعد جب میں اپنے برادرانِ یوسف کی مہربانیوں اور اپنے خوں ریز دل کی خوش فشانیوں کے ہاتھوں برباد ہو کر حیدرآباد پہنچا تو وہاں فانی نے مجھے لکھا کہ بھائی میرے حالات ناقابلِ برداشت حد تک بگڑ چکے ہیں۔ لکھو تو حیدرآباد آکر قسمت آزمائی کروں۔ میں نے جواب میں لکھا۔ ''آجاؤ بھائی۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔'' چنانچہ فانی حیدرآباد آگئے اور میرے یہاں قیام تھا۔

فانی صاحب کی ملازمت کے سلسلے میں کیا کیا ہفت خواں طے کرنا پڑے، اس کی شرح نہ پوچھئے اور کن کن سفیہوں کی بارگاہ میں اپنی خودداری کے ماتھے کا پسینہ فروخت کرنا پڑا اس کی داستاں نہ سنیئے وہ تو کہئے کہ اس وقت شاعروں کے سب سے بڑے قدردان مہاراجہ کشن پرشاد زندہ تھے کہ انہیں ملازمت مل گئی ورنہ دولتِ آصفیہ کی علم نوازی انہیں کبھی کامیاب نہ ہونے دیتی۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ انہیں کیا نوکری ملی؟ ایک معمولی مدرسے کی ہیڈ ماسٹری!

کفن بیاورد تابوت و جامہ نیلی کن که روزگار طبیب است و عافیت بیمار

اور یہ بھی سن لیجئے کہ شاندار ہیڈ ماسٹری بھی تھوڑے ہی زمانے کے بعد فانی سے چھین لی گئی۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنی مدت میں مرا لپٹا میرا بستر کھلا

واضح باد کہ اس حیدرآباد عظیم میں جو ہندوستان کا غرناطہ و بغداد تھا جلیل مانک پوری بھی رہتے تھے اور فانی بدایونی بھی جلیل استاد شاہ تھے اور فانی گدائے راہ:۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن چھوٹ گیا

نوکری چھوٹ جانے کے بعد جب تک مہاراجہ کشن پرشاد زندہ رہے فانی کی اشک شوئی کا سلسلہ جاری رہا لیکن اُن کے انتقال کے بعد فانی کو ایک بڑی سرکار میں رسائی کا شرف حاصل ہو گیا تھا لیکن اس سرکار نے فانی کے خون سے اپنے گلستاں کو سیراب کر لیا مگر فانی کی کشتِ حیات پر ایک بوند بھی نہ برسائی۔

میں فانی کو انہیں دردمندیوں میں چھوڑ کر ۱۹۳۳ میں حیدرآباد سے دہلی چلا گیا۔ بلکہ زیادہ صحت کے ساتھ یہ بات یوں کہنی چاہیئے کہ اپنی ایک باغیانہ نظم کی بدولت الحمد للہ میں نظام حیدرآباد کا معتوب ہو کر ۱۹۳۳ء میں خارج البلاد کر دیا گیا۔

خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما در آں باشد

اس اخراجِ بے احتجاج کے بعد ۱۹۳۹ء میں فانی سے میری ملاقات جے پور کے مشاعرہ میں ہوئی۔ مجھ نامراد کو کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ حیف! اس کے بعد ایسے بچھڑے کہ پھر ملے ہی نہیں۔

جے پور میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بھیا سوزِ معاش تو تھا ہی اب حیدرآباد کے دوستوں نے بھی مجھ سے نگاہیں پھیر لی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ میں "غیر ملکی" ہوں مجھے حیدرآباد رہنے کا حق نہیں ہے۔ واضح ہو کہ اس دور میں وہاں "ملکی" و "غیر ملکی" کی تحریک بڑے زور پر تھی ہر چند کہ حیدرآباد دکن ہندوستان ہی کی ایک ریاست تھی مگر وہاں کے لوگ اپنے کو ہندوستان سے علیحدہ تصور کرتے تھے اور ہم لوگوں کو "ہندوستانی" کہہ کر بلاتے تھے چنانچہ اسی سے متاثر ہو کر فانیؔ صاحب نے اپنی ایک غزل "زماں سے دور" ۔ "مکاں سے دور" کا یہ مقطع بڑے درد کے ساتھ جے پور میں سنایا تھا:۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم   ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی کی زندگی کا آخری زمانہ اپنے دوستوں سے بدگماں رہنے کا ایک مستقل و مسلسل دور تھا اور ان کی انسانی بے زاری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنے مخلص ترین احباب کے متعلق بھی آنکھوں آنکھوں میں کہا کرتے تھے:۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ان کے کمرے میں جب کوئی مچھر داخل ہوتا تو وہ سمجھتے تھے کہ میرے فلاں دوست نے اس مچھر کو میری طرف اس لئے روانہ کیا ہے کہ وہ مجھ کو کاٹ کر ملیریا میں گرفتار کر دے چنانچہ ان کی اس عام دوست بیزاری کی بنا پر ان کے رفقا نے ان سے ملنا جلنا کم، اور بعض نے تو ترک ہی کر دیا تھا۔ افسوس کہ فانیؔ سے روٹھ جانے والے رفقاء نے فانی کی ناکام زندگی اور فانی کی بدانجام عاشقی پر غور کر کے ان کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من   وز درونم کس نہ جست اسرارِ من

کسی اللہ کے بندے نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ وہ شخص جس کے پیٹ کو روٹی اور جس کے پہلو کو محبوب کبھی میسر نہیں ہوتا، جس پر ہر آن کارواں در کارواں شدائد حملہ آور ہوتے رہے ہیں اور زمانہ جس سے کسی حصۂ عمر میں بھی سازگاری نہیں کرتا اس شخص کے واسطے یہ تقریباً ناممکن ہو جاتا

ہے کہ وہ احباب و معاشرے کو شریف و شائستہ خیال کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکے۔ دوست تو پھر انسان ہیں شدائدِ حیات کا استقلال و تسلسل تو بری بلا ہے۔ بڑے بڑے خدا سے منحرف ہو کر چیخ اٹھتے ہیں کہ

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تو اں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

گدے پر گاؤ تکیہ لگا کر فلسفیانہ باتیں کر لینا آسان ہے، لیکن مصیبت میں بھی فلسفی رہنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ فلسفہ موسلا دھار بارش میں ایک چھوٹی سی چھتری بن کر رہ جاتا ہے۔ بیشک ایک لاکھ میں ایک آدمی ایسا بھی نکل آتا ہے کہ شدید مصائب میں بھی فلسفے کے حبل متین کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، اور وہ انگاروں پر لوٹ کر بھی ایسا ہی باحواس رہتا ہے جیسے کہ فرشِ گل پر بیٹھنے والے لیکن فانی سے نازک بدن، گداز قلب زن مزاج اور شدید ترین حساس شاعر کے واسطے یہ ناممکن تھا کہ وہ بلاؤں کے دو گٹرے میں بھی اپنے حواس بجا رکھ سکتا۔ چنانچہ عشق و معاش دونوں میں مسلسل ناکام رہنے کی بنا پر فانی مجبور ہو گئے کہ وہ پوری انسانیت اور پورے معاشرے سے بدگمان ہو جائیں اور اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ اُن میں ایک گونہ تفکر کا بھی جوہر تھا وہ اس امر پر بھی مائل و مجبور ہو گئے تھے کہ وہ صرف بادرد بساز تیج درماں مطلب ہی پر عمل نہ کریں بلکہ رفتہ غم سے شدید قسم کی محبت بھی کرنے لگیں اور میر تقی کی آواز میں آواز ملا کر کہنے لگیں۔

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

چنانچہ ہم جب فانی کا کلام پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنسوؤں کی ندی کے ساحل پر سنگِ موسیٰ کا ایک بڑا مندر ہے جس کے وسط میں غم کی دیوی کا بت رکھا ہوا ہے اور ایک سیاہ پوش برہمن ہے جو دھڑکتے ہوئے دل کی گھنٹی بجا بجا کر پوجا کر رہا ہے۔

نہ جاگنے میں یہ لذت نہ شب کے سونے میں　　اگر مزا ہے تو پچھلے پہر کے رونے میں

اور پھر دوسرا بھجن یوں گا رہا ہے:۔

اپنے بندے پر اب اتمام کرم کر یارب

در و دیوار دیے، اب انہیں ویرانی دے

بیشک فانؔی ایک غم پرست شاعر تھے، اس لئے حالات و رفتار مزاج کے سبب سے وہ ایک غم پرست شاعر کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ان کا غم بہت گنف اور ان کے آنسو بہت گاڑھے تھے، اور یہاں تک کہ موسمِ بہار میں بھی جب کہ ہر دل کی کلی کھل جاتی ہے وہ رو رو کر کہتے تھے۔

کہ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فانؔی ہماری زبان کے تنہا غم پرست شاعر تھے، اس لئے کہ جب ہم اپنے شاعروں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ سب کے سب، بلا استثناء روتے یا کم سے کم بسورتے نظر آتے ہیں۔

شعرائے اُردو کی اس عام غم پرستی کے متعدد تاریخی معاشرتی سیاسی و ذہنی اسباب ہیں جن کی شرح طوالت کا باعث ہوگی اور ان اسباب کے ساتھ ساتھ ہماری شاعری میں غیر فطری غزل گوئی کی بناء پر ایک ایسا روایتی و مصنوعی غم طاری ہو گیا ہے کہ ہمارے آغوشِ زمزمۂ شادمانی میں زندگی بسر کرنے والے نواب، روسا اور ہز ہائنس بھی جب غزل فرماتے ہیں تو ماتم ہی کرتے نظر آتے ہیں۔

بہر حال، ان اسباب کے باعث، نیز اپنے حالات و افتادِ مزاج کی بنا پر فانی صاحب یہی نہیں کہ غمگین بلکہ شدت سے ایک غم پرست شاعر تھے، بلکہ وہ ایک فلسفۂ غم کے امام بھی تھے اور پرورشِ غم کو زندگی کا حاصل خیال کرتے تھے۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ فانؔی کے مکان پر چند یارانِ خرابات جمع تھے اور شغل ناؤ نوش جاری تھا فانؔی ایک گوشے میں ایک ایسے برہمن کے مانند لیٹے یا یوں کہنا چاہیئے کہ پڑے ہوئے تھے جس کی انکھوں کے سامنے گائے ذبح کی جاری ہو! فانؔی آس گنو، بتیا کو برداشت نہیں کر سکے۔ انہوں نے

بڑے رازدارنہ اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کان میں مجھ سے کہا "کیا غم غلط کر رہے ہو؟" اس سوال کے وقت فانی کے چہرے پر ایک ایسا رنگ دوڑ گیا جیسے وہ کسی زبردست عذاب کے نازل ہو جانے کی پیشین گوئی فرما رہے ہوں۔ میں نے فانی کے رخسار پر ہاتھ پھر کر جواب دیا "ہاں پیارے غم غلط کر رہا ہوں" یہ سنتے ہی ان کا رنگ فق ہو گیا اور میرے کان میں کہا میاں جوشؔ غم ایک امانتِ الٰہی ہے، اسے غلط نہ کرو، اس لئے کہ اس کا غلط کرنا خیانت میں داخل ہے!"

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فانی غم کو محبوب و معشوق ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے اُلوہی تقدس کو بھی وابستہ کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ فانی کے ذہنی قبیلے کے تمام شاعروں کی شاعری افراد و اقوام کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے، لیکن اس کے باوجود میرے زمانے کے غزل گویوں میں فانی ہی ایک ایسے غزل گو تھے جو سوچ سمجھ کر شعر کہتے تھے۔ روایتی غزل سازی سے انہیں کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں تھا وہ عام جاہل غزل گویوں کے برعکس ایک تعلیم یافتہ اور صاحب فکر انسان تھے اور وہ جو کچھ بھی کہتے تھے، وہ آپ بیتی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہر چند کے مجھے ذاتی طور سے ان کے غم پرستانہ مسلمات و نظریات اور ان کے فلسفۂ حیات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا، لیکن بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ فانی ہی وہ شخص تھا جس نے غزل گوئی کی سی مصنوعی و روایتی صنف کو فطری و بامعنی صنف بنا دیا تھا۔ اور اسی بنا پر فانی باقی رہے گا۔ اس کا کام میرے اور دنیا بھر کے نظریاتی اختلاف کے باوصف زندہ اور اس لئے زندہ رہے گا کہ اس میں خلوص، جذبہ اور تاثرات کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور وہ جیسا محسوس کرتے تھے ویسا ہی کہتے بھی تھے۔ ان کے کلام میں ایک سچائی پائی جاتی ہے کہ اگر آگے چل کر وہ جھوٹ بھی ثابت ہو جائے، پھر بھی وہ اپنے معتقی کے سچے سُروں کو کبھی فنا نہیں ہونے دے گا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(مارچ ۱۹۶۶ء)

پبلک ہائی اسکول

(کینٹ کراچی)

میں
بچیوں سے خطاب

(بہ تقریبِ تقسیمِ اسناد)

اے بچیو! پیاری بچیو، راج دلاری بچیو،

میں مردوں کے کارہائے نمایاں سے واقف اور اُن کی عظمت کا لوہا ماننے والوں میں سے ہوں، لیکن تم میں اور مردوں میں یہ فرق ہے کہ وہ لوہے کی چادریں ہیں، تم ریشم کے پلو ہو، وہ کڑی دھوپ ہیں، تم سہانی چاندنی ہو، وہ معمار ہیں، تم تاج محل ہو، وہ تلوار ہیں، تم شاخ ہائے گل ہو، وہ شعلے ہیں، تم شبنم ہو، وہ چمن آراء ہیں، تم سر سے پاؤں تک چمن ہو۔ ہاں یہ صرف تم اور صرف تم ہو جس نے اس وحشی انسان جانور یعنی مرد کو رام کیا ہے، اور اس کوہ و بیاباں میں گھومنے والے کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈال دی ہیں۔ مردوں کے گلے میں زمانہ حال کے پھندے پڑے ہوئے ہیں اور تمہاری گودوں میں زمانہ مستقبل ہمک رہا ہے۔ تمہارے لہجے، تمہاری نشست و برخاست کے طریقے اور تمہاری نظریں ایسے خاموش مدرسے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر نئی نسلیں پروان چڑھیں گی۔ اور تمہارے کلمات زندگی بھر ان کے خون میں دوڑتے رہیں گے۔

اے بچیو! میں چاہتا ہوں تم اپنی اہمیت سے آگاہ ہو جاؤ اور ابھی سے تیاری شروع کر دو اُن

فرائض کی جن کا بار تمہارے شانوں پر آنے والا ہے، چوٹی سے پکڑلو وقتِ رواں کو اور یاد رکھو کہ یہ زندگی چھوٹے چھوٹے لمحوں کے موتیوں کا ایک گندھا ہوا ہار ہے، اگر تم نے اس کا ایک دقیقہ بھی ضائع کر دیا یا ایک موتی بھی توڑ ڈالا تو یہ ہار بدنما ہو کر رہ جائے گا۔ اور ایک موتی کے بقدر تمہاری زندگی گھٹ جائے گی۔

وقت کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ ہر آن دھڑا دھڑ بہتا چلا جا رہا ہے اور ہر سانس ایک نئی تبدیلی پیدا کر رہی ہے۔ یہ تبدیلی کا کاروبار اس سُرعت سے جاری ہے کہ آئینے میں تم اپنے چہرے کو دوبارہ دیکھ نہیں سکتیں اس لئے کہ تمہارا چہرا اور آئینہ دونوں تغیرات کے دھارے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس کمسنی کے موڑ کو غنیمت جانو اور آئندہ زمانے کے واسطے مسلح ہو جاؤ، بے شک یہ تمہارے کھیل کود کے دن ہیں لیکن کھیل کود کی لَے کو اس قدر بڑھنے نہ دو کہ وہ تمہارے حصول علم کے رشتے کو کاٹ دے۔۔۔۔۔ بچیو! ۔۔۔۔۔ گھبرا گھبرا کر علم حاصل کرو، اپنے دماغوں کے دریچوں کو کھولو اور اپنے شعور کی لوؤں کو ہر آن اُکساتی رہو، میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ علم سے جی چرا کر اگر آج ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھوگی تو تمام عمر دھوپ تمہارا تعاقب کرتی رہے گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ قدرت نے تم کو مردوں کی طرح قوی بنانے میں بخل سے کام لیا ہے، لیکن اُن کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمہاری نزاکت کے اندر وہ سختی ہے جو بچوں کی فطرت کے لوہے کو گلا ڈالتی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ کرۂ ارض تاریک رہتا۔ انسانیت، شرافت اور شاعری کو فروغ حاصل نہ ہوتا۔ اگر تم سیف ساں نگاہیں نہ چبھوتیں تو انسان کے دل سے فاسد مادہ نکل نہ سکتا۔ اور نوعِ بشر کی آفاقی محبت کا چراغ حشر کے دن تک نہ جل سکتا۔

تم پر مردوں کو ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ قدرت نے آج تک تم میں سے کسی کو پیغمبری کا مرتبہ عطا نہیں کیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس کو پیغمبری کی حاجت کیا ہے، جس کو جوہر تخلیق بخش کر خدائی کا منصب عطا فرما دیا گیا ہے۔

(۱۶-۲-۷۴، کراچی)

الفاظ اور شاعر

(حصہ اول)

الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوا کی گرہیں۔ الفاظ تو ذی حیات ہیں۔ انسانوں کی روح ذی حیات۔

الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے اور اور تندرست ہوتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرے کا رواج ہے۔ یہ بھی انجمنیں اور سوسائٹیاں بنا کر رہتے اور ترقی کے مدارج سے انہیں بھی گزرنا پڑتا ہے۔

ان میں بھی مختلف نسلیں، خاندان اور شجرے ہوتے ہیں اور ہر خاندان اپنے ہی عزیزوں اور کُفو میں شادی کرتا ہے۔

الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی اور بڑھاپے کی فضائیں آتی ہیں ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیک نام ہوتے ہیں اور بعض بدنام۔ بعض عبائیں پہنے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں، بعض دستاریں زیب سر کیے ہوئے، درباروں اور بعض ننگے پاؤں بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں بعض کے ہاتھ چومے جاتے ہیں اور بعض جب دروازے پر آتے ہیں تو انہیں دھتکار دیا جاتا ہے۔

ان میں متقی و پرہیزگار بھی ہوتے ہیں اور آزاد، خراباتی بھی۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ متوسطین کا طبقہ ان میں بھی اہمیت رکھتا ہے، اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

الفاظ میں بھی ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ انتہا درجے کے شریف، رقیق القلب اور بُردبار ہوتے ہیں اور بعض بڑے درجے کے مُفسد، اور سفاک اور دل آزار۔ ان میں سے بعض تو

باقی قسم کے ہوتے ہیں اور بعض چپراسی ذہنیت کے۔ بعض بزم کے رسیا ہوتے ہیں اور بعض رزم کے مرد میدان۔ بعض کی کمروں پر تولا بے پرتلوں کی تلواریں لٹکی رہتی ہیں اور بعض گلے میں پھولوں کی بدھیاں اور کان میں سونے کے دُر پہنتے ہیں۔

لیکن تمام الفاظ میں یہ ایک عجیب مشترکہ وعمومی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بے ہمہ وباہمہ رہنا پسند کرتے ہیں، ملتے تو سب سے ہیں مگر اپنے کو لئے دیئے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ شرمیلے ہوتے ہیں کہ مغرور۔ مگران سب کی عادت ہے کہ جلد بے تکلف ہوجانے کو بہت ہی برا سمجھتے ہیں اور دیر آشنائی پر کاربند رہتے ہیں۔

آدمی کے حافظے کی کمزوری یا درس وتدریس کے شوق نے نہایت ہی گستاخی کے ساتھ انہیں لغات کی نمائشی الماریوں میں سجادیا ہے۔ یہ ان الماریوں میں طوعا، "وکرہا" بیٹھے تو ہیں مگر بڑی چالاکی کے ساتھ، انہوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈال رکھی ہیں، تاکہ انہیں بہ آسانی پہچانا نہ جاسکے اور مکمل خدوخال تو کبھی نمایاں ہی نہ ہوسکیں۔

جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان کے پیچھے نہ پڑجائے ان کی گلیوں کی خاک نہ چھان ڈالے، مہینوں نہیں برسوں ان سے ملے جلے نہ، ان کی میزبانی نہ کرے، ان کے گھر مہمان نہ رہے، سالہا سال تک ان کے ساتھ نشست وبرخاست نہ رکھے، ان کی غمی وشادی میں شریک نہ ہو، ان سے رشتہ ناتا نہ جوڑے، ان کی نبضوں کی رفتار، ان کے خون کی گردش اور ان کے خاندانی وذاتی خصوصیات کو نہ پرکھ لے، اُس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اُس سے بے تکلف نہیں ہوتے، اور اسے اپنے مزاج کی اُفتاد اور اُسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے۔

انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ رسم وراہ اور مخلصانہ دوستی ہے۔

ادیبوں سے ہر چند ان کی ملاقات دوستانہ اور مخلصانہ ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا بھی کرتے ہیں۔ لیکن بعض نازک مزاج، اَسرار پسند اور نغمہ پرور اونچے گھرانوں کے الفاظ ان سے کھل کھیلنا اور خلاملا رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اگر ادیبوں کے سامنے آتے بھی

ہیں تو ان شوخ وشنگ لڑکیوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب ان کا دامن پکڑ لینے کے لئے لپکو تو انگلیاں چٹکاتی اور قہقہے مارتی ہوئی الٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔

البتہ شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں ہی کا سا نہیں، قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیا یار۔

شاعروں کو انہوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں، ان کی لے اور رنگ بدل دیں، ان کا رخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کر دیں، ان کے خط وخال میں کمی بیشی فرما دیں۔

شاعر سے ان کے گھروں کی عورتیں، بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں، وہ جب چاہے، دوپہر ہو یا آدھی رات بے دھڑک ان کے گھروں اور خواب گاہوں میں آ جا سکتا ہے۔

شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج ان نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں۔ ذات پات اور رنگ و مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی، وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کوزے میں پیتے، اور ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادت گاہ ہے، جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے جیسی راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔

اکثر اوقات روحانی لمحوں اور وجدانی ساعتوں میں جب کہ شاعر کے احساسات، انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں، جن میں بوڑھے، جوان لڑکے اور لڑکیاں سب ہی ہوتے ہیں، شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچتے اور گاتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم جھلکنے لگتا ہے اور کبھی ذروں سے لے کر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔

○

جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریروں کے متعلق چند تحقیقی وضاحتیں

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں آج
میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں
(جوشؔ)

جوشؔ صاحب ہماری ادبی تاریخ کے ان تخلیق کاروں میں سرِفہرست ہیں جن کے کثیر التصانیف ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ 'کثرتِ ظہور' اور 'شدتِ وجود' کی وسعتوں میں ان کی تحریریں بھی شدت و کثرت کے ساتھ بکھری ہوئی ہیں [۱] اس اعتبار سے بھی وہ موجودہ صدی کے تنہا شاعر ہیں کہ ان کا نثری سرمایہ بھی ان کی شعری تخلیقات کی طرح وسیع، ہمہ گیر، ضخیم اور تہ بہ تہ ہے۔ اُن کی

۱۔ ۱۹۹۲ء میں راقم السطور کی کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں' (جلد اوّل) شائع ہوئی۔ پیشِ نظر کتاب 'اوراقِ جوش' میں اس کی بیشتر تحریریں شامل ہیں کئی اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ سابقہ کتاب میں جو نادر و نایاب تحریریں یکجا کی گئی تھیں ان کے متعلق تحقیقی اظہار اس کے مقدمے میں کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ موجودہ کتاب میں گزشتہ کتاب کی اکثر تحریریں شامل ہیں اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان نایاب تحریروں سے متعلق جو تحقیقی پس منظر ہے قاری کو اس سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے سابقہ کتاب کے مقدمہ کو اس موجودہ کتاب کے آخری صفحات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ پیشِ نظر رہے کہ گزشتہ کتاب کی جو تحریریں شامل نہیں کی گئی ہیں ان سے متعلق وضاحتیں حذف کر دی گئی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ مقدمہ ۱۹۹۲ء کی تحریر ہے۔

شاعری کی عمر کم و بیش ۷۵ ربرسوں پر محیط ہے۔ کسی شاعر کے تخلیقی سفر کے لیے سن وسال کا یہ اثاثہ کچھ کم نہیں اور پھر خصوصاً جوش جیسے شاعر کے لیے جن کی زندگی کے بیشتر لمحات مشاہدے اور تجربے کی دنیا میں سفر کرتے رہے ہوں۔ اتنے تسلسل، اتنی پابندی اور اتنے استحکام و اعتبار کے ساتھ کم شعراء نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ہے۔

شاعری سے قطع نظر، نثری ادب میں ان کے دیباچے، مقدمے، تقاریظ، اداریے، مقالے، انشائیے، انٹرویوز، اخباری کالم، مبارکباد کے پیغامات، تبصرے اور تعزیت نامے خود ایک جداگانہ ادبی تاریخ رکھتے ہیں۔ 'آجکل' اور 'کلیم' میں ان کے اداراتی نوٹ، مختلف ادبی و علمی شخصیات کی وفات پر ان کی تعزیتی سطور اخبار 'جنگ' کراچی میں ان کے سیاسی اور فکری کالم، ہمعصر شعراء اور ادباء پر تنقیدی آراء اور ان کے خطوط جو نہ صرف ان کی سوانح کے ذیل میں ایک تاریخی درجہ رکھتے ہیں بلکہ ہمارے عہد کی ادبی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی کے نشیب و فراز کا ایک تہذیبی آئینہ بھی ہیں۔

جوش صاحب کے شب و روز سے جن کو آگہی حاصل رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے اوقاتِ کار کا بیشتر حصہ مطالعے اور اسرارِ کائنات کے تجزیے کے لیے وقف ہوتا، اُن کے لیے صبح مشاہدے کا پیغام لے کر نمودار ہوتی، مطالعہ ان کے روزانہ کے معمولات کا جزو لازم ہوتا۔ یہ پابندیٔ اوقات، ابتدائے عمر ہی سے ان کے روز و شب کا حصہ رہی۔ یہی سبب ہے کہ نثری اور شعری، دونوں سطح پر ان کی مطبوعات، اپنی تعداد کے اعتبار سے بھی بہت نمایاں ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام 'روحِ ادب' لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد جو مجموعے شائع ہوتے رہے وہ یہ ہیں: آوازۂ حق (۱۹۲۱ء لکھنؤ)، جذباتِ فطرت (۱۹۲۱ء لکھنؤ)، شاعر کی راتیں (۱۹۳۳ء دہلی)، پیغمبرِ اسلام (دہلی)، نقش و نگار (۱۹۳۶ء دہلی)، شعلہ و شبنم (۱۹۳۶ء دہلی)، فکر و نشاط (۱۹۳۷ء دہلی)، جنون و حکمت (۱۹۳۷ء دہلی)، حرف و حکایت (۱۹۳۸ء دہلی)، آیات و نغمات (۱۹۴۱ء لاہور)، حسینؑ اور انقلاب (۱۹۴۱ء بمبئی) عرش و فرش (۱۹۴۳ء بمبئی)، رامش و رنگ (۱۹۴۵ء بمبئی)، سنبل و سلاسل (۱۹۴۷ء بمبئی)، سیف و سبو (۱۹۴۷ء لاہور)، سرود و خروش

(۱۹۵۳ء دہلی)، سموم وصبا (۱۹۵۵ء کراچی)، طلوعِ فکر (۱۹۵۷ء کراچی)، قطرہ و قلزم (۱۹۶۳ء دہلی)، الہام و افکار (۱۹۶۶ء لاہور)، نجوم و جواہر (۱۹۶۷ء لاہور)۔ ان کی زندگی ہی میں ان کا آخری شعری مجموعہ 'جوش ملیح آبادی کے مرثیے' ۱۹۸۰ء میں ضمیر اختر نقوی نے کراچی سے شائع کیا۔ نثر میں اب تک ان کے چھ مجموعے ہمارے سامنے ہیں۔ مقالاتِ زریں (۱۹۲۱ء لکھنؤ)، اوراقِ سحر (۱۹۲۱ء لکھنؤ)، اشارات (۱۹۴۲ء دہلی)، یادوں کی بارات (۱۹۷۰ء کراچی)، مقالاتِ جوش (۱۹۸۲ء کراچی) اور مکالماتِ جوش و راغب (۱۹۸۸ء کینیڈا)۔

جوش صاحب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بنیادی مسئلہ ان کی غیر مطبوعہ تحریریں ہیں۔ یہ تحریریں کہاں کہاں ہیں اور کس کس کے پاس ہیں؟...... اس ذیل میں ظاہر ہے ان کے بیٹے سجاد حیدر خروش سب سے پہلا حوالہ قرار دیے جائیں گے۔ جوش صاحب کا بیشتر غیر مطبوعہ ادبی سرمایہ انہی کی تحویل میں ہے۔ یہ سرمایہ انہیں جوش صاحب کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء) کے بعد منتقل ہوا۔ اس وقت وہ اسلام آباد میں اپنے والد کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ بعد میں وہ کراچی میں جوش صاحب کے گنبد والے مکان ۱۳۸۔ ڈی، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا میں مع اہل و عیال آ گئے۔ اسی مکان میں جوش صاحب کی اکلوتی بیٹی سعیدہ خاتون کا ۲۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوا۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں یہ مکان بیچ دیا گیا اور اب سجاد حیدر صاحب بفرزون میں رہتے ہیں جوش کا تمام ادبی سرمایہ بھی انہی کے ساتھ ہے لیکن اب جبکہ جوش صاحب کی وفات کو دس برس گزر چکے ہیں اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ اس ادبی اثاثے کو شائع ہونا چاہیے۔ اس میں اردو ادب کا بہت گراں قدر خزانہ منظوم اور غیر منظوم دونوں صورتوں میں موجود ہے: 'حرفِ آخر' جیسی طویل نظم جو کم و بیش ۳۰ ر ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے اسی ذخیرے کا حصہ ہے۔ لغات کے حوالے سے بھی بعض انتہائی اہم نوادرات اس میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سجاد حیدر صاحب اور ان کے اہلِ خانہ ان غیر مطبوعہ نوادرات کو شائع کرنے کے سلسلے میں برابر کوشاں ہوں گے مگر اس معاملے میں انہیں اب زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے ادبی تاریخ گواہ ہے کہ حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں ایسے قیمتی ادبی جواہرات بکھر بھی جایا

کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی ہماری نظر میں ہے اور وہ یہ کہ اہلِ تحقیق کے لیے جوش صاحب کے حوالے سے، اصل مسئلہ وہ تحریریں نہیں ہیں جو سجاد حیدر خروش صاحب کے پاس محفوظ ہیں بلکہ وہ غیر محفوظ تحریریں ہیں جو ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ ادبی تحریریں مختلف نجی کتب خانوں میں بھی ہو سکتی ہیں۔ بعض قریبی احباب کی نوٹ بک میں بھی۔ کسی اخبار کے مدیر کے پاس، ادبی یا غیر ادبی رسائل کے دفتر میں پرانے کاغذات کے درمیان، جوش صاحب کے چاہنے والوں کی ذاتی ڈائریوں میں یا کیسٹ میں، پھر ان خطوط کا بھی ایک دفتر ہے جو اب تک شائع نہ ہو سکے اور جن کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی ایک بڑا تحقیقی معرکہ ہے کہ یہ کس کس کے پاس ہیں۔ جوش صاحب کی جو تحریریں کھو گئیں یا ان کے پاس سے کوئی 'اٹھا' کرلے گیا ان کی بھی ایک الگ داستان ہے۔ کراچی کے ایک مشاعرے میں جس کا اہتمام ریڈ کراس نے کیا تھا، ان کی ۳۰۰ر غیر مطبوعہ رباعیاں غائب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی رباعیات کے مجموعے 'قطرہ و قلزم' (مطبوعہ ۱۹۶۳ دہلی) میں رباعیوں کے غائب ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور حیرت اس بات پر ہے کہ وہ اس شخص کو جانتے بھی ہیں لیکن تحریراً اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے۔ شاید یہ ان کی انسان دوستی ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس زمانے میں بیسویں صدی کی مرثیہ نگاری کی تاریخ پر ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا انہوں نے اسلام آباد سے ایک خط (مرقومہ ۱۸؍اگست ۱۹۷۷ء) میں اپنے مرثیے 'آگ' کے بارے میں خود مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ یہ مسدس اب تک کسی سے مل سکا یا نہیں۔ بعد میں کراچی میں جب میں ان سے ملا اور اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا مسدس 'آگ' عیش ٹونکی لے گئے تھے۔[۲] یادوں کی برات کے حوالے سے جوش صاحب نے ایک بار مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے بعض ابواب چھپنے سے پہلے کوئی لے اُڑا۔ انہوں نے ایک بار یہ بھی بتایا تھا کہ غالباً ۱۹۶۱ء میں جب وہ یوم قلی قطب میں شرکت کے لیے دکن گئے تھے تو ان کی

۲۔ کراچی کے ریڈیو اسٹیشن پر ایک ملاقات میں عیش ٹونکی صاحب سے جب میں نے اس مرثیے کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جوش صاحب کا مرثیہ 'خاک' بھی غالباً کہیں کھو چکا ہے۔ ضمیر اختر نقوی کی کتاب 'جوش ملیح آبادی کے مرثیے' میں بھی یہ مرثیہ شامل نہیں ہے۔

کچھ نظمیں راستے میں کہیں گر گئی تھیں۔ اپنی سب سے طویل نظم 'حرفِ آخر' کا ایک جزوی حصہ بھی انہیں دوبارہ لکھنا پڑا تھا۔ بقول ان کے یہ حصہ گھر میں ہی کہیں کھو گیا۔[۲] جوش صاحب کے نواسے سراج انور خاں نے بھی ان کی تحریروں کے ضائع ہو جانے کا متعدد بار مجھ سے تذکرہ کیا ہے۔ صبوحی خاتون کے بیٹوں یعنی جوش صاحب کے پرنواسوں انجم ناصر اور کلیم ناصر نے جن سے اکثر و بیشتر میری ملاقات ہوتی ہے مجھے بتایا کہ ہم نے فیڈرل بی ایریا والے مکان میں نانا کے لکھے ہوئے بعض کاغذات کو ڈرائنگ روم سے متصل کمرے کی چوکھٹ کے پاس پانی میں تیرتے دیکھا۔

ان دونوں بھائیوں نے یہ بھی بتایا کہ:

> 'نانا نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب 'روحِ اقبال' کے ہر صفحے پر اپنی رائے لکھی تھی۔ وہ ہم نے خود دیکھی تھی ہمارے گھر کے غسل خانے کی کارنس پر وہ بہت دنوں پڑی رہی۔ اندازہ یہی ہے کہ وہ ہمارے کسی اہلِ خاندان ہی کے پاس ہوگی۔'

جس زمانے میں جوش صاحب کے پاس میرا روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا، مجھے یہ بھی ان کی گفتگو سے پتہ چلا تھا کہ 'دیوانِ حافظ' اور شبلی کی کتاب 'موازنۂ انیس و دبیر' پر بھی انہوں نے انہی کتابوں کے مختلف صفحات پر اپنی رائے لکھی تھی۔ سید سبطِ حسن کی ایک تصنیف پر بھی ان کے حاشیے تھے۔

جوش صاحب کی کچھ غیر مطبوعہ تحریریں تو میرے پاس بھی تھیں۔ انتھک محنت اور مسلسل دوڑ دھوپ کے نتیجے میں جن افراد سے غیر مطبوعہ تحریروں کے نسخے مل سکے ان میں اولین نام راغب مراد آبادی، خورشید علی خاں اور شان الحق حقی صاحب کے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام ماخذات کی تفصیل یہ ہے:

۲۔ جوش صاحب نے 'حرفِ آخر' کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ نئے سرے سے اس نظم کو تنقیدی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں انہوں نے فرمایا تھا کہ دنیا میں اب معاشرتی، اقتصادی، فکری اور سائنسی سطح پر بہت ارتقا ہو چکا ہے اسی کو پیشِ نظر رکھ کر میں بعض حصوں کو بدلنا اور اضافے بھی کرنا چاہتا ہوں۔

جناب راغب مرادآبادی کے ذخیرۂ نوادرات سے

جوش صاحب کے حلقۂ احباب اور ان کے ہم نشینوں میں راغب صاحب کی حیثیت مرکزی رہی ہے۔ ان کا اور جوش صاحب کا تعلق کم و بیش نصف صدی کا ہے۔ دریا گنج دہلی میں ۱۹۳۵ء سے جو رشتۂ عقیدت و اخلاص قائم ہوا تھا وہ جوش صاحب کی وفات ۱۹۸۲ء تک باقی رہا۔ خصوصاً کراچی میں وہ ان کے ہمہ وقت ساتھی رہے۔ اس اعتبار سے جوش صاحب کی تخلیقی زندگی سے بھی انہیں بڑی باخبری ہے۔ ان کے ذخیرۂ نوادرات سے جوش صاحب کی جو غیر مطبوعہ تحریریں مجھے مل سکیں اور اس کتاب میں شائع کی جارہی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ 'الفاظ اور شاعر (حصہ دوئم)' — یہ مختصر مقالہ جوش صاحب کو ترقی اردو بورڈ کراچی کی ایک میٹنگ میں پڑھنا تھا مگر کچھ ایسے معاملات حائل ہو گئے کہ وہ پڑھ نہ سکے۔

۲۔ پریم چند — ہندوستان کے ایک ریسرچ اسکالر جو پریم چند پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے انہیں یہ تحریر راغب صاحب کے اصرار پر جوش صاحب نے لکھی تھی اس کی نقل سے میں نے استفادہ کیا۔

۳۔ یادوں کی برات کا ایک گمشدہ ورق۔

۴۔ مکتوب بنام راغب مرادآبادی

خورشید علی خاں صاحب کی ذاتی ڈائری سے

جوش صاحب کے حلقۂ احباب میں خورشید علی خاں صاحب (کسٹم) بہت بعد میں شامل ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں کراچی میں جوش صاحب کے دولت کدے پر ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور ان کے گرویدہ ہو گئے اور پھر یہ تعلق خاطر اس قدر جلد مستحکم اور گہرا ہو گیا کہ جوش صاحب اسلام آباد سے جب کراچی تشریف لاتے تو اکثر انہی کے یہاں ٹھہرتے۔ ان سے مجھے جو غیر مطبوعہ تحریریں ملیں ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ پبلک ہائی اسکول (کینٹ کراچی) میں بچوں سے خطاب

۲۔ مکالمہ مابین شبیر حسن خاں اور جوش ملیح آبادی

۳۔ مکتوب بنام ذہین شاہ تاجی

۴۔ مکتوبات بنام خورشید علی خاں

۵۔ نظم، صبح دیر سے بیدار ہونے پر

۶۔ نظم 'حرف آخر سے اقتباس' ارتقا کا اعلان

۷۔ سہانی سزائیں

شان الحق حقی صاحب کے توسط سے

ترقی اردو بورڈ کے حوالے سے شان الحق حقی اور جوش صاحب کے تعلقات ایک علیحدہ موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی تعلق کی اہمیت کے پیش نظر حقی صاحب سے میں نے جب جوش صاحب کے قلمی نوادرات کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے ایک ایسی 'کاپی' دی جو عموماً اسکول کے طالب علم استعمال کرتے ہیں۔ یہ کاپی جوش صاحب کی کئی تحریروں پر مشتمل ہے اس میں عموماً جو تحریریں ہیں وہ سن ساٹھ اور اکسٹھ کے آس پاس کی ہیں قیاس یہی ہے کہ بورڈ کے بعض کاغذات کے ساتھ یہ حقی صاحب کے گھر کی میز پر پہنچ گئی اور پھر کہیں دبی رہی۔ درج ذیل تحریریں اسی کاپی سے ماخوذ ہیں:

۱۔ غیر مرتب — ابو العالمین — ، چند سطریں، میرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی — اجزا و عناصر۔

جناب راغب مرادآبادی، خورشید علی خاں صاحب اور حقی صاحب کے علاوہ جن دیگر افراد و شخصیات سے باقی غیر مطبوعہ تحریریں ملیں ان کی تفصیل خلاصے کی صورت میں یہ ہے:

۱۔ متحدہ اردو محاذ کے بارے میں جوش صاحب کا پیغام (قلمی) ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر یاور عباس صاحب سے ملا۔

۲۔ ڈاکٹر عالیہ امام اور ان کے والد سید محمد عسکری مرحوم کے متعلق جوش صاحب کی دو تحریریں نصیر ترابی کے توسط سے عالیہ امام صاحبہ سے ملیں۔

۳۔ ۱۹۷۷ء میں جوش صاحب کی صاحبزادی سعیدہ خاتون سے جو نادر تحریر ملی وہ 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے شامل ہے۔

۴۔ جوش صاحب کے ایک انتہائی قریبی رفیق منور عباس ایڈوکیٹ مرحوم کے بڑے صاحبزادے جناب مظفر عباس سے جوش صاحب کے جن دو خطوط کی فوٹو اسٹیٹ نقل ملی ان میں ایک ڈاکٹر رالف رسل کے نام ہے اور دوسری معروف سیاستداں میاں ممتاز دولتانہ صاحب کے نام۔

۵۔ جوش صاحب کی بڑی نواسی صبوحی خاتون سے ایک خط بہت شکستہ صورت میں ملا۔ یہ خط ان کے شوہر حسن ناصر خاں کی ناگہانی وفات پر جوش صاحب نے لکھا تھا۔

۶۔ جوش صاحب کے نواسے سراج انور خاں نے چند غیر مطبوعہ خطوط دیے جس میں ایک خط خود ان کے نام اور باقی ان کی والدہ سعیدہ خاتون کے نام ہیں۔

اس کتاب میں غیر مطبوعہ تحریروں کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کی چند مطبوعہ مگر انتہائی نادر تحریریں جو اب نایاب ہو چکی ہیں انہیں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض کی وضاحت حاشیوں میں کر دی گئی ہے۔ باقی نادر تحریروں کا تذکرہ درج ذیل سطور میں ہے:

۱۔ جلال لکھنوی اور میر بارق کے بارے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے جوش صاحب نے ۱۹۵۷ء میں ایک مضمون پڑھا تھا اور اگلے برس 'تنگنائے غزل' کے عنوان سے اپنے ادبی افکار کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں جنوری اور اگست ۱۹۵۸ء کے 'ماہِ نو' نے ان کو شائع کر دیا تھا۔ یہ شمارے اب بہت نایاب ہیں۔ مجھے یہ دونوں شمارے عزیز دوست سید علی کرار نقوی کے نادر کتب خانے سے ملے۔

۲۔ ۱۹۶۰ء میں راغب مراد آبادی صاحب نے 'ے راکتوبر' (کراچی) کے نام سے ایک ادبی ماہنامے کا آغاز کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی اس کے سرپرست تھے۔ چند شماروں کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی تھی۔ جولائی ۱۹۶۰ء اور اگست ۱۹۶۰ء کے شمارے میں جوش صاحب کے دو انتہائی اہم مضامین شائع ہوئے۔ یہ دونوں شمارے مجھے راغب

صاحب کے کتب خانے سے ملے۔

۳۔ ایک زمانے میں جوش صاحب کے جو کالم اخبار جنگ کراچی میں شائع ہوئے ان میں اپریل ۱۹۶۳ء کی ایک اشاعت میں شائع ہونے والا مضمون بھی نادر تحریروں کے ذیل میں 'اسلام ایک اصلاحی و انقلابی تحریک' کے عنوان سے اس کتاب کا حصہ ہے۔

ہلال نقوی

(۵ر فروری ۱۹۹۲ء)

اشاریہ

(افراد و اشخاص)

خاندانِ جوش کے کچھ ناموں کا اشاریہ

جوش صاحب اپنے بیٹے اور بیٹی کی اولاد اور خاندان کے بعض دوسرے افراد کو بھی ان کے اصلی ناموں سے مخاطب نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے لیے کچھ خطابات بنالیے تھے۔ جن سے وہ انہیں پکارا کرتے تھے۔ پیش نظر کتاب میں وہ حصہ جو جوش صاحب کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو اہل خانہ کے نام ہیں۔ ان میں یہ خطابات آئے ہیں۔ اشاریے کے درج ذیل حصے میں انہی خطابات کی وضاحت کردی گئی ہے جو ڈاکٹر ہلال صاحب سے دریافت کرنے کے بعد قلمبند کیے گئے ہیں:

شعری کتب

نثری کتب

ادبی رسائل

اخبارات

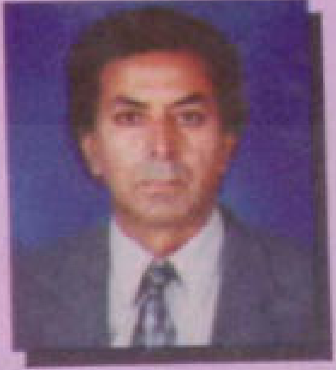
انجمنیں، تنظیمیں، شعبے، تجارتی اور اشاعتی ادارے

مقامات

متفرقات

(ترتیب اشاریہ)

مہرالنساء عزیز، ریسرچ اسسٹنٹ، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی



اس کتاب کے مرتب و مؤلف ڈاکٹر ہلال نقوی کی ادبی شناخت کا بنیادی حوالہ اگرچہ ان کی شاعری ہے لیکن تلاش و تحقیق کے سفر میں بھی وہ اپنی نوجوانی ہی سے شریک ہیں۔ اب تک ان کی ۱۸ سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں مقتل و مشعل (۱۹۷۶ء)، بیس تاریخ (۱۹۸۳ء)، جمیل مظہری کی مثنوی آب و سراب (۱۹۸۹ء)، مسدس فریاد و جواب فریاد (۱۹۸۹ء)، جمیل مظہری کے مرثیے (۱۹۸۹ء)، مرثیات جوش (۱۹۹۲ء)، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں (۱۹۹۲ء)، ارمغان نسیم (۱۹۹۳ء)، کلیات واجد (۱۹۹۳ء)، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ (۱۹۹۴ء)، اذان مقتل (۱۹۹۳ء)، دفتر دیر (۱۹۹۵ء) اور رثائی ادب کے عظیم انیس نمبر (۲۰۰۳ء) کے علاوہ بھی کئی تالیفات ہمارے پیش نظر ہیں۔ قریب الاشاعت تالیفات میں بیشتر تنقیدی و تحقیقی کام جوش ملیح آبادی سے متعلق ہے۔ انہی تحقیقی، تنقیدی مصروفیتوں کے درمیان ڈاکٹر ہلال کا شعری مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کی تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف جن شخصیات نے اپنی تحریروں میں کیا ہے ان میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مجنوں گورکھپوری، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر ممتاز حسین، کیفی اعظمی، نسیم امروہوی، جمیل الدین عالی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، انتظار حسین، سلیم احمد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر محمد رضا کاظمی کے علاوہ کئی اور نام بھی لیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور ۱۹۸۵ء میں اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ادبی حوالوں سے لندن، ٹورنٹو، اوسلو، ہلسنکی، دہلی، کویت، مشہد، دمشق، جدہ اور دوحا قطر میں منعقدہ تقریبات میں مقالے پڑھ چکے ہیں۔ اپنی شاعری سے بھی وہاں کے سننے والوں کو انھوں نے مستفیض کیا ہے۔

ہماری ادبی تاریخ اور ہماری صدی کے جن بڑے تخلیق کاروں کی تحریریں اب تک صحیح طور پر محفوظ نہ ہو سکیں ان میں جوش ملیح آبادی کا نام سب سے پہلے لیا جانا چاہیے۔ ان کی شاعری اور نثر کے مطبوعہ مجموعے بھی نایاب ہیں اور غیر مطبوعہ تحریریں تو انتہائی منتشر ہیں وقت کے ساتھ ساتھ ان منتشر تحریروں کے اوراق بھی بکھرتے چلے جا رہے ہیں۔ اوراق جوش، ان ہی نایاب اور بکھری ادبی تحریروں کے ایک دستیاب حصے کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی تلاش و تحقیق سے کتاب کی صورت دی ہے۔ اس کتاب میں جوش صاحب کے گراں قدر مقالے، فکر انگیز مضامین اور نایاب خطوط بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے ایک بہت اہم تالیف کا درجہ رکھتا ہے کہ اس کے توسط سے تاریخ، تہذیب، مذہب، ادب، لسانیات اور انسانی زندگی کی مسرتوں اور محرومیوں پر ہم اپنے عہد کی ایک نامور ادبی شخصیت اور عظیم شاعر کے خیالات پڑھ سکیں گے جس سے یقینی طور پر ان تحریروں والے فکر کا کوئی نہ کوئی دریچہ ہمیں روشنی اور آگہی کے کسی افق کی نشاندہی کر سکے گا۔

اظہار سنز

19- اردو بازار لاہور فون: 37230150

ہیڈ آفس: 9- ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761

E-mail: izharsons_2004@hotmail.com

www.izhar-sons.com